

احمقوں کی جنت

جی آر اعوان



اُحمقوں کی جنت

جی آر اعوان

گوہر سکنز

نسلہ حقوق محفوظ

نام کتاب :	احقوق کی جنت
مصنف :	جی آرا عوان
طبع اول :	1999ء
تعداد :	500
کمپوزنگ :	محمد اکرام الحق
طابع :	اے این اے پرنٹرز
قیمت :	110/- روپے
اہتمام :	محمد احسن تہامی

گوہر سنز

رحمن مارکیٹ ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار ، لاہور۔ فون ۷۲۳۱۱۱۹

ISBN 969 - 8370-05-6

ہو بندہ آزاد اگر صاحب الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
محکوم کے الہام سے اللہ بجائے
عارت گر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

(اقبل)

انتساب

اپنے پیارے لبا جی صوفی فضل کریم صاحب
کے نام
جنہوں نے ربوہ کے قصر خلافت میں
”احمدی ہم ہیں تم نہیں“
کا نعرہ حق بلند کیا۔

”مرزا قادیانی برطانوی اغراض کا روحانی بیٹا تھا۔
قادیان مرزائیت کی جائے پیدائش، ربوہ اعصابی
مرکز، تل ابیک تربیتی کیمپ، لندن پناہ گاہ، ماسکو استاد
اور واشنگٹن اس کا بینک ہے۔“

(شورش کاشمیری)

فہرست

نمبر شمار عنوانات صفحہ نمبر

1	فکر و عمل کا تضاد	1
14	الہامات کی رواؤں میں لپٹے ہوئے افراد کا اصل کردار	2
20	روداد الفت	3
23	غایت تحریر	4
27	دیرانی سی دیرانی	5
32	پینے پہ کوئی پابندی نہیں	6
37	جو تک نہیں لگتی پتھروں کو	7
47	احمدی تو ہم ہیں	8
56	چلتی پھرتی لائبریری	9
63	بے وفادوست سے کے ٹو سگریٹ اچھا	10
74	احقوں کی جنت	11
80	حوریں	12
88	غلام	13
93	نام نہاد صحابیوں کی افراط	14
99	گھونگٹ کی ہوا	15
107	پلے بوائے	16
115	طلسمی صندوق	17
121	کو تو ال شمر	18
129	منافقت کے چکنے چکنے پات	19

134	ربوہ کا سالانہ میلہ	_20
139	کوفیوں کا شر	_21
144	مرزائیت گزیدہ	_22
150	اقبال دشمنی	_23
159	یہاں سیلاب نہیں، آسمانی عذاب آئے گا	_24
170	قرآن کریم کے لفظ ”ربوہ“ کا تحقیقی مطالعہ	_25

فکر و عمل کا تضاد

اللہ تعالیٰ کے آخری رسول محمد و احمد علیہ السلام کی غلامی کے صدقے نبی بننے کا دعویٰ کرنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کا اس غلامی پر ناز کرنے کی بجائے یہ نسبت ختم کر دینا اور خود محمد اور احمد (علیہ السلام) بن بیٹھنا دنیا کی تاریخ کا منفرد سانحہ ہے۔ جو مسلمانوں کے لئے ایک مستقل فتنہ ہے تو اس کی وجہ مرزا قادیانی کا دعویٰ کے بعد دلائل گھڑنے کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کے الفاظ تک کا تقدس اور سیاق و سباق ہی نظر انداز نہیں ہوا بلکہ الفاظ و معانی کی نئی دنیا بسائی گئی، لغات و اصطلاحات کا نیا جہان آبلو ہوا، رسول اللہ علیہ السلام کی حدیث مبارکہ کو قبول اور مسترد کرنے کی بنیاد روایت اور درایت کا کوئی اصول نہیں بلکہ اس کا اپنے دعویٰ کے لئے کار آمد ٹھہرنا اس کے صحیح و غلط ہونے کا پیمانہ بن گیا۔ اخلاقیات کے بھی اپنے معیار بنائے گئے اس لئے مرزا قادیانی کے فکر و عمل کی پوری کائنات پیاز ثابت ہوئی جھلکے پہ چھلکا اٹارتے جائیے نتیجہ

کچھ نہیں نکلے گا۔ مثلاً "مرزا قادیانی نے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا لیکن کبھی تیرھویں صدی اور کبھی چودھویں صدی کے مجدد ہونے کی بات کی گئی (۱)۔ کبھی کہا وہ تیرھویں صدی کے پورے ہونے پر ظاہر ہونے والا مسیح ہے (۲)۔ یہ بھی کہا مثیل ہونے کا دعویٰ کیا ہے جس کو کم فہم لوگ مسیح موعود خیال کر بیٹھے ہیں (۳)۔ مگر ساری عمر اپنے نام کے ساتھ مسیح موعود لکھتے رہے۔ یہ بھی کہا کہ مسیح موعود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہو سکتے۔ وہ تو نبی ہیں اور نبی اب آ نہیں سکتا اور امتی آپ ہو نہیں سکتے کہ نبی ہیں (۴) مگر جب مرزا نے خود نبی ہونے کا دعویٰ کیا تو امتی بھی ٹھہرے (۵)۔ نلی اور غیر تشریعی نبی (۶) اور تشریعی نبی ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا (۷)۔ دعویٰ یہ بھی ہے کہ میں جھوٹا ہوتا تو دعویٰ کے بعد ۲۳ سال تک زندہ نہ رہتا (۸)۔ لیکن جھوٹا دعویٰ کب کیا اس کا کوئی تعین نہیں (۹)۔ شاید اسی لئے کہا لفظ نبی کاٹا ہوا سمجھیں (۱۰)

جبکہ مرزا کے دوسرے جانشین کا کہنا یہ ہے کہ مرزا قادیانی نبوت کا فہم نہیں رکھتے تھے (۱۱)۔

مرزا قادیانی کی شخصیت کے بارے میں دو + دو = چار کی طرح یہی کلیہ بن سکتا ہے کہ دعویٰ پہلے اور دلائل بعد میں گھڑنے کی وجہ سے دعوای اور نتائج میں ربط نہیں رہا۔ دعوای بلند آہنگ اور نتائج اتنے ہی پست مرتب ہوئے۔ اس ضمن میں یہاں چند مثالیں اس لئے بھی ضروری ہیں کہ ”احقوں کی جنت“ میں قادیانیوں کے صرف کردار کا ذکر ہے۔ نظری بحث سے قاری کو کردار سے پہلے قادیانیت کے فکر و نظر سے آگاہ ہونے میں مدد ملے گی۔

مرزا کے دعوای و دلائل میں واضح فرق کی پہلی مثال کا مجمل ذکر شروع میں ہوا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد بزرگ ترین ہستی محمد و احمد علیہ السلام کی غلامی کے نتیجے میں منصب نبوت پر فائز ہونے کا دعویٰ کیا گیا (۱۲) اور اسی نسبت کو ختم کر دیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے غلام کی نسبت ”سابقہ یا رواج کہہ کر ختم کی یا یہ سورہ الصف کی آیت مبارکہ نمبر ۶ کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس بشارت کا مصداق بننے کی کوشش میں ختم ہوئی کہ میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہو گا۔ بہر حال یہ نسبت ختم ہوئی۔ اور اپنے ہاتھوں ختم کی گئی پہلے مرزا قادیانی نے بروز مظہر، بعثت دوم وغیرہ کے حوالے سے (۱۳) بعد میں مرزا کے دوسرے جانشین مرزا بشیر الدین محمود نے حتمی فیصلہ دے دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق تو بس مرزا قادیانی ہے (۱۴) ۱۹۹۱ء میں مرزا کے چوتھے جانشین مرزا طاہر احمد کی سوانح حیات ایک برطانوی صحافی آئن ایڈمن سے لکھوائی گئی A Man of God نامی اس کتاب میں شروع سے آخر تک مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر احمد علیہ السلام کی غلامی کا شرف حذف کر کے ہوا اور صرف احمد نام متعارف کرایا گیا۔

احمد علیہ السلام کی غلامی شرف انسانیت پر فائز ہونے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام کے سوا دیگر کی غلامی سے نجات کی ضامن تھی۔ یہ ضمانت کیا ختم ہوئی مرزا قادیانی

سے ملک و قوم کی غلامی کے خاتمہ کے بارے میں سوچنے لکھنے اور کچھ کرنے کی صلاحیت ہی سلب ہو گئی۔

(2) یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ ”آنحضرت ﷺ کی پیروی کمالات نبوت بخشی ہے اور آپ کی روحانی توجہ نبی تراش ہے (۱۵)۔“ لیکن رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور نبی تراش توجہ سے قیامت تک صرف ایک (وہ بھی خود ہی) نبی بننے کا نتیجہ نکلا گیا (۱۶)۔ اور ساتھ ہی یہ دعویٰ کہ ہر ایک نبی کی شان مجھ میں پائی جائے اور ہر ایک نبی کی صفت کا میرے ذریعہ ظہور ہو۔“ (۱۷)۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا قادیانی کو ایک مکمل انسان قرار دینے میں بھی تامل روا ہے (۱۸)۔ نبوت کے سلسلے میں یہ بھی دعویٰ ہے کہ نبوت کی تمام کھڑکیاں بند کی گئیں مگر ایک کھڑکی سیرت صدیقی کی کھلی ہے یعنی فنا فی الرسول پس جو شخص اس کھڑکی کی راہ سے خدا کے ہاں آتا ہے اس پر نعلی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے جو نبوت محمدی کی چادر ہے (۱۹)۔ اس حوالے سے اپنے رسولؐ ہونے کا دعویٰ ایک صفحہ پہلے کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں سیرت صدیقی کی اس کھڑکی سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی اللہ کے پاس نہ آئے جبکہ وہی پہلے فنا فی الرسولؐ ہیں جو رسول اللہ ﷺ میں فنا ہونے کے باوجود صدیق رہے۔ رسول نہیں بنے جیسے ایک قادیانی غلام، ”حق میں فنا ہونے کے دعویٰ کے بعد خود فنا نہیں ہوا بلکہ جس میں فنا ہونے کا دعویٰ کیا وہی یعنی اپنا آقا بن بیٹھا۔ اور اس کے نتیجے میں غلام ہونے کے شرف سے محروم ہو گیا کہ ایسا دعویٰ غلامی کا نتیجہ ہی نہیں۔“

(3) مرزا قادیانی نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ”یہ بات واقعی سچ ہے کہ جو مسلمان ہیں یہ قرآن شریف کو بالکل نہیں سمجھتے اب خدا کا ارادہ ہے کہ صحیح معنی قرآن کے ظاہر کرے خدا نے مجھے اس لئے مامور کیا ہے اور میں اس کے الہام اور وحی سے قرآن شریف کو سمجھتا ہوں“ (۲۰)۔ یہ دعویٰ 23 اکتوبر 1903ء کو کیا گیا جبکہ 28 مئی 1897ء کی ایک تحریر میں کہا گیا ”میری تالیفات ----- اور بھی ہیں جو نہایت مفید ہیں جیسے رسالہ احکام القرآن اور اربعین فی علامات المقربین اور سراج منیر اور تفسیر کتاب

عزیز (۲۱) - دوسرے الفاظ میں ”الہام اور وحی سے قرآن شریف کو سمجھتا ہوں“ کے دعویٰ پر مبنی تفسیر تالیف ہو چکی تھی مگر یہ تفسیر آج تک منظر عام پر نہیں آ سکی جبکہ مرزا کو ”اسی لئے مامور“ کیا گیا۔

مرزا قادیانی کی جو تفسیر سامنے لائی گئی وہ باقاعدہ نہیں بلکہ دیگر تالیفات میں موجود مختلف آیات مبارکہ کی تفسیر ایک ترتیب سے جمع کر دی گئی اس میں زیادہ حصہ سورہ فاتحہ بلکہ اس کے آخری حصہ پر مشتمل ہے۔ اتفاق دیکھئے ”مرزا قادیانی کے قرآن کے صحیح معنی“ سے اختلاف مرزا کے جسمانی و روحانی جانشین مرزا بشیر الدین محمود نے کیا۔ ترجمہ کس کا صحیح ہے بحث اس سے نہیں غور طلب بات یہ ہے کہ مرزا محمود نے اپنے والد کا ترجمہ قرآن ”مامور کا ترجمہ“ نہیں سمجھا۔ مرزا قادیانی کی ”بیان فرمودہ“ تفسیر سورہ فاتحہ میں اس سورہ مبارکہ کی آخری آیت مجیدہ کا ترجمہ کئی بار ہوا اور ہر مرتبہ ایک بات مختلف انداز میں کی گئی۔ لیکن مرزا محمود نے کسی ایک انداز کو قبول نہیں کیا اور اپنی تفسیر صغیر و کبیر دونوں میں اس سے قطعی مختلف ترجمہ کیا جبکہ مرزا محمود کے داماد پیر معین الدین نے اپنے سرسری تفسیر کی تلخیص ”مخزن معارف“ میں مرزا قادیانی کا ترجمہ لیا اور مرزا محمود کا ترک کر دیا۔

اب صحیح ترجمہ کا ایک نمونہ پیش ہے جس کے لئے مرزا قادیانی کا مامور ہونے کا دعویٰ ہے۔ سورہ اخلاص، سورہ الفلق اور سورہ الناس کا ترجمہ یہ کیا گیا ”تم اے مسلمانو! نصاریٰ سے کہو کہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے اور تم جو نصاریٰ کا فتنہ دیکھو گے اور مسیح موعود کے دشمنوں کا نشانہ بنو گے یوں دعا مانگا کرو کہ میں تمام مخلوق کے شر سے ----- خدا کی پناہ مانگتا ہوں ----- اور میں اندھیری رات کے شر سے جو عیسائیت کے فتنہ اور انکار مسیح موعود کے فتنہ کی رات ہے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔-----“ (۲۲) یاد رہے ”بیان فرمودہ“ تفسیر سورہ فاتحہ میں اس ترجمہ کو جگہ نہیں مل سکی شاید اس کے مرتب اسکے صحیح معنی نہیں سمجھے!

مرزا نے ایک حدیث کا ترجمہ یہ کیا ہے ”کیا حدیث اما کم منکم کے یہی معنی نہیں کہ آنے والا عیسیٰ، اے امتی لوگو! تم میں سے ہیں نہ کسی اور قوم سے (۲۳) اور یہ کہ ”صحیح بخاری میں آنے والے عیسیٰ کی نسبت صاف لکھا ہے کہ اما کم منکم یعنی اے امتیو! آنے والا عیسیٰ بھی صرف ایک امتی ہے نہ اور کچھ“ جبکہ صحیح بخاری میں یہ امام مہدی کے بارے میں لیکن مرزا قادیان نے حرف ”و“ اور اس کا ترجمہ حذف کر دیا مگر ایک سوال کے جواب خود ہی صحیح مفہوم واضح کر دیا ”حدیث میں آیا ہے کہ مسیح جو آنے والا ہے وہ دوسروں کے پیچھے نماز پڑھے گا“ (۲۵)

اب ترجمہ کے ضمن میں مرزا قادیانی کے ایک الہام کے چند تراجم دیکھیں جو تمام مرزا قادیانی کے ہیں اس الہام کا انتخاب اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ اس کے تمام جیسے قرآن مجید کی مختلف آیات میں معمولی تصرف کا نتیجہ ہیں۔ ایک سورہ تبت کی پہلی آیت ہے اور دوسری سورہ الاحقاف کی آیت نمبر 35 کا پہلا حصہ ہے دیگر کے لئے الانفل 8، 30، القصص 38، البقرہ 114، سورہ النساء 79 ایک نظر دیکھ لیں۔

مرزا قادیانی کا الہام یہ ہے اذا يمكر النفي كفر او قلن يا هاهنا لعلی اطلع علی اله موسى و انی لا ظننه من الکاذبین تبت یدنا ابی لهب و تب ما کان له ان یدخل فیها الا خائفا و ما اصابک فمن الله الفتنه ههنا فاصبر کما صبر الرالعزم۔

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ ”اور جب تیرے ساتھ مکر کیا اس شخص نے جس نے کفر کی راہ اختیار کی اے ہامان! میرے لئے آگ روشن کر شاید کہ موسیٰ کے معبود کی اطلاع پا سکوں اور میں اس کو جھوٹوں میں خیال کرتا ہوں۔ ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور ٹوٹ گیا وہ خود اس کے لئے نہیں چاہئے تھا کہ داخل ہو اس میں مگر اس حالت میں کہ وہ خائف ہو اور جو تکلیف تجھ کو پہنچی ہے پس یہ اللہ تعالیٰ سے ہے یہ فتنہ ہے پس صبر کر جیسا کہ صبر کیا اولوالعزم لوگوں نے (۲۶)

اب مرزا قادیانی کے تراجم پڑھیں اور صحیح ترجمہ کے لئے مامور ہونے کی داد دیں!

(۱) وہ زمانہ یاد کر جب کہ کمفر تجھ پر تکفیر کا فتویٰ لگائے گا اور اپنے کسی حامی کو جس کا لوگوں پر اثر ہو سکتا ہو کہے کہ میرے لئے فتنہ کی آگ بھڑکتا میں دیکھ لوں کہ یہ شخص جو موسیٰ کی طرح کلیم اللہ ہونے کا مدعی ہے خدا اس کا معلوم ہے یا نہیں اور میں تو اسے جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ ابی لب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور آپ بھی ہلاک ہو گیا اس کو نہیں چاہئے تھا کہ اس میں دخل دیتا مگر ڈر ڈر کر اور جو رنج تجھے پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے (۲۷)

(۲) یاد کر جب کمفر نے بغرض کسی مکر کے اپنے رفیق کو کہا کہ کسی فتنہ یا آزمائش کی آگ بھڑکا تاکہ میں موسیٰ کے خدا پر یعنی اس شخص کے خدا پر مطلع ہو جاؤں کیونکہ وہ اس کی مدد کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہے یا نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے یہ کسی واقعہ آئندہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو بصورت گزشتہ بیان کیا گیا ہے ابی لب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور وہ بھی ہلاک ہوا اور اس کو لائق نہ تھا کہ اس کام میں بجز خائف و ترسواہ ہونے کے یونہی دلیری سے داخل ہو جاتا اور جو تجھ کو پہنچے تو وہ خدا کی طرف سے ہے یہ کسی شخص کے شر کی طرف اشارہ ہے جو بذریعہ تحریر یا بذریعہ کسی اور فعل کے اس سے ظہور میں آئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس جگہ فتنہ ہے بس صبر کر جیسے اولعزم لوگوں نے صبر کیا ہے (۲۸)

(۳) اور یاد کروہ آنے والا زمانہ جب کہ ایک شخص تیرے پر تکفیر کا فتویٰ لگائے گا اور اپنے کسی ایسے شخص کو جس کے فتویٰ کا دنیا پر عام اثر ہوتا ہو کہے گا اے ہامان میرے لئے اس فتنہ کی آگ بھڑکتا میں اس شخص کے خدا پر اطلاع پاؤں اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے ہلاک ہو گئے دونوں ہاتھ ابی لب کے اور وہ بھی ہو گیا (یعنی جس نے یہ فتویٰ لکھا یا لکھوایا) اس کو نہیں چاہئے تھا کہ اس معاملہ میں دخل دیتا مگر ڈرتے ڈرتے -----

(۲۹) اور پھر فرمایا کہ اس فتویٰ تکفیر سے جو بھی تکلیف تجھے پہنچے گی وہ تو خدا کی طرف سے ہے یہ ایک فتنہ ہو گا بس صبر کرو جیسا کہ اوالعزم نبیوں نے صبر کیا (۳۰)

(۴) اور یاد کرو وہ وقت جب تیرے پر ایک شخص سراسر مکر سے تکفیر کا فتویٰ دے گا۔۔۔۔۔ (۳۱) اور پھر فرمایا کہ وہ اپنے بزرگ ہامان کو کہے گا کہ اس تکفیر کی بنیاد تو ڈال کہ تیرا اثر لوگوں پر بہت ہے اور تو اپنے فتویٰ سے سب کو فروخت کر سکتا ہے سو تو سب سے پہلے اس کفر نامہ پر مر لگا تا سب علماء بھڑک اٹھیں اور تیری مردیکہ کر وہ بھی مہر لگا دیں اور تاکہ میں دیکھوں کہ خدا اس شخص کے ساتھ ہے یا نہیں کیونکہ میں اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں (تب اس نے مر لگا دی) ابولہب ہلاک ہو گیا اور اس کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے (ایک ہاتھ جس کے ساتھ تکفیر نامہ کو پکڑا اور دوسرا وہ ہاتھ جس کے ساتھ مر لگائی یا تکفیر نامہ لکھا) اس کو نہیں چاہئے تھا کہ اس کام میں دخل دیتا مگر ڈرتے ڈرتے اور جو تجھے رنج پہنچے گا وہ تو خدا کی طرف سے ہے جب وہ ہامان تکفیر نامہ پر مر لگا دے گا تو بڑا فتنہ برپا ہو گا بس تو صبر کر جیسا کہ اوالعزم نبیوں نے صبر کیا (۳۱)

(۵) یاد کرو وہ زمانہ جب کہ ایک مولوی تجھ پر کفر کا فتویٰ لگائے گا اور اپنے کسی حامی کو جس کا لوگوں کو اثر ہو سکے گا کہے گا کہ میرے لئے اس فتنہ کی آگ بھڑکا یعنی ایسا کر اور اس قسم کا فتویٰ دے دے کہ تمام لوگ اس شخص کو کافر سمجھ لیں تاکہ میں دیکھوں کہ اس کا خدا سے کیا تعلق ہے یعنی یہ جو موسیٰ کی طرح اپنا کلیم اللہ ظاہر کرتا ہے۔ کیا خدا اس کا حامی ہے یا نہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے۔ ہلاک ہو گئے دونوں ہاتھ ابی لب کے (جب کہ اس نے یہ فتویٰ لکھا) اور وہ آپ بھی ہلاک ہو گیا اس کو نہیں چاہئے تھا کہ اس کام میں دخل دیتا مگر ڈر ڈر کر اور جو رنج تجھے پہنچے گا وہ خدا

کی طرف سے ہے (۳۲)

ان تراجم کو تفسیری ترجمہ بھی قرار دیں تو بھی ان کے صحیح ہونے کی گنجائش نہیں۔ جہاں تک ”الہامی اور وحی پر مبنی تفسیر“ کا تعلق ہے تو مرزا قادیانی کے پہلے جانشین نور الدین، دوسرے جانشین مرزا بشیر الدین محمود اور لاہوری جماعت کے امیر محمد علی بھی اس سے مطمئن نہیں اور جبکہ اس سے اختلاف کیا اس سلسلے میں تفصیلات حافظ عنایت اللہ اثری کی تصنیف ”مرزا صاحب قادیانی (اور) قرآن مجید سے نادانی“ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہاں نور الدین کے تفسیری نکات پر مشتمل ”حقائق الفرقان“ کا صرف ایک حوالہ کافی ہے۔ سورہ البقرہ کی آیت مبارکہ نمبر 259 کی تفسیر کے تحت ہے۔ ”حضرت صاحب یعنی مرزا قادیان - ناقل) سے میں نے ایک دفعہ اس آیت کے معنی دریافت کئے تو آپ نے فرمایا میں نے جب الہی میں توجہ کی تو مجھ پر کھلا کہ وہ شخص واقعی مر گیا تھا عرض کیا پھر سو سال کے بعد اٹھنا کیا معنی؟ فرمایا کہ انبیاء کے مرنے کے بعد ایک حیات دی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ پھر عرض کیا وہ آیت کس طرح ہے؟ فرمایا کیا مردہ آیت نہیں ہو سکتا؟۔۔۔۔۔۔ چونکہ میری طبیعت میں شرم اور ادب بہت تھا اس لئے میں نے یہ نہ پوچھا کہ **انظر الی طعامک و شرابک ہم یقسمہ** کا کیا مطلب ہوا ہے۔ یہ بھی یاد رہے ”حقائق الفرقان“ کے پیش لفظ میں تذکرۃ الہدیٰ ج ۱ ص ۲۴۳ کے حوالے سے درج ہے کہ مرزا قادیانی فرمایا کرتے تھے کہ ”حضرت مولوی نور الدین صاحب کی تفسیر قرآن آسمانی تفسیر ہے۔“

اب مرزا قادیانی کے دو تفسیری نکات درج ہیں

(الف) ”آیت ان علیٰ فہاب بہ لقادرون (۳۳) میں 1857ء کی طرف اشارہ ہے۔۔۔۔۔۔ جس کی نسبت خدا تعالیٰ آیت موصوفہ بلا میں فرماتا ہے کہ جب وہ زمانہ

آئے گا تو قرآن زمین سے اٹھالیا جائے گا“ (۳۴)

(ب) ”اگر کوئی ہم سے سیکھے تو سارا قرآن ہمارے ذکر سے بھرا ہوا ہے۔“ (۳۵)

”اگر کوئی ہم سے سیکھے“ کی شرط بھی خوب ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مرزا قادیانی

نے قرآن اور صاحب قرآن ﷺ سے جو سلوک کیا اسے جاننے کے بعد بھی کوئی مرزا سے یکے کا تو یہی جانے گا کہ **ما یضل بہ الا الغاسقین** (البقرہ-۲۶) یعنی قرآن مجید سے گمراہی تو بس فاسقین ہی پاسکتے ہیں۔

مرزا قادیانی کے بلند دعوای مگر پست نتائج کے اس تجزیے میں مرزا قادیانی کا اپنا کردار بھی واضح ہے۔ مرزا کے پیروکاروں کا اس سے متاثر ہونا لازمی امر تھا اسے پروفیسر محمد الیاس بنی سے جناب شفیق مرزا تک کئی اصحاب علم و فضل زیر بحث لائے ہیں تاکہ مسلمان اسے فتنہ سے محفوظ رہ سکیں۔ ہمارے دوست جی آر اعوان نے بھیرہ کے محلہ اسلامی بلغ سے لاہور کے بلغ گل بیگم تک کے سفر میں ربوہ اور چنیوٹ میں بھی قیام کیا (۳۶) اس قیام کے دوران جو دیکھا اسے طاہر رزاق صاحب کے اصرار پر سپرد قلم کیا۔ اس کار خیر میں میرا حصہ صرف یہ تھا کہ طاہر رزاق صاحب کو اعوان صاحب سے متعارف کرایا جس کی اس دنیا میں یہ جزا ملی کہ پہلے ہر باب کا خلاصہ سنا اور پھر مسودہ پڑھا اور ایڈٹ کیا۔ اعوان صاحب سے روز نامہ ”پاکستان“ میں متعارف ہوا وہ میرے نقش قدم پر ”خبریں“ سے ”جنگ“ پہنچے۔ دفتر اور اس سے باہر میری ان سے دوستی مثالی بنتی جا رہی ہے۔

”احمقوں کی جنت“ کے تعارف کے سلسلے میں یہ لکھنا مبالغہ ہے نہ بے جا کہ اس سے مرزا قادیانی کے بارے میں قائم میرے اس کلیہ اور تاثر کو تقویت ملی ہے کہ دعوای بلند مگر نتائج پست نکلے۔ قادیانیوں نے پاکستان میں اپنی آبادی کا نام ربوہ (بلند یا پہاڑی مقام) اس لئے رکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہما السلام کی جائے پناہ کو قرآن حمید نے ربوہ قرار دیا (المومنون-۵۰) اور مرزا بشیر الدین محمود نے اسے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ سے تشبیہ دی (۳۷) لیکن قادیانیوں کا کردار اپنی آبادی کے نام سے برعکس رہا۔ جہاں اصل احمدیوں یعنی مسلمانوں کو غیر احمدی اور احمد ﷺ سے تعلق نہ رکھنے والوں کو احمدی کہا گیا۔ قیام پاکستان میں ان لوگوں کا کیا کردار رہا یہ الگ موضوع ہے ان کے مردے آج بھی قادیان جانے کے منتظر

ہیں اس لئے اپنی نئی نسل کو ”یہ ہے ہمارا ہندوستان“ کا درس دیا جاتا رہا۔ مرزا طاہر کے بارے میں جو کتب لکھوائی گئی اس میں مرزا طاہر کی نوجوانی کی ایک نظم ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ربوہ میں ہے آج کل جاری نظام اپنا
ہے قلدیاں لیکن ابدی مقام اپنا

یہ وہ قلدیاں ہیں جس میں مرزا قلدیانی نے مسیح موعود کا دعویٰ کرنے کے بعد یہ کہہ کر ایک مینار تعمیر کرایا کہ احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مینار پر اترنے کا ذکر ہے (۳۸) یہی وہ منارہ ہے جسے دیکھنے کے لئے مرزا کے ”صحابی“ اور ”ملنگ“ دیوانے بنے ہوئے ہیں اور پھر ان ملنگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ملنگوں کا موازنہ کر کے مسلمانوں کو اشتعل دلایا جاتا ہے جب کہ علامہ اقبال اور مرزا قلدیانی کی بیٹی مبارکہ بیگم سے کلام کا موازنہ کرنے والے قلدیانی پر وفسر کا یہ کارنامہ بھی قابل ذکر ہے کہ مرزا قلدیانی کا نام لئے بغیر فرخ (مرزا کا تخلص) کو بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی اور اپنا مضمون فریب سے ایک سرکاری ماہنامہ میں چھپوا لیا جس میں خواجہ غلام فرید کے بارے میں مغالطہ انگیزی سے کام لیا گیا جب کہ حقیقت جاننے کے لئے ”مقائیس المجالس“ کا مقدمہ دیکھنا ہی کافی ہو گا۔

اعوان صاحب نے درس چھبوں سے لے کر رہائش چھبوں اور ”حلیفہ“ کے لئے پروٹوکول کی تفصیل پر مبنی طبقاتی نظام کا تذکرہ بھی کیا ہے وہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ جماعت کچھ بھی ہو اس کا نبوت سے تعلق ہے نہ خلافت سے اور اس کا پورا نظام فریب پر قائم ہے۔

محمد انور طاہر

لاہور

حوالہ و حواشی

- (۱) ازالۃ الادھام ص ۶۵۳، ۱۵۴، تحفہ گولڑویہ ص ۱۰۲، ۱۰۳
- (۲) ایضاً ص ۱۸۵، ۱۸۶
- (۳) ایضاً ص ۱۹۰ بلکہ سب انبیاء علیہم السلام کے مثل ہونے کا دعویٰ کیا (ازالہ ص ۲۵۳) لیکن کسی ایک نبی علیہ السلام کے مثل ہونے کا شرف بھی حاصل ہوتا تو بھی نبوت کا دعویٰ نہ ہوتا کہ آیت میثاق کے تحت سب انبیاء علیہم السلام، ختم الرسل علیہم کی پیروی کے پابند ہیں مثل تو ان سے بھی بڑھ کر!
- (۴) ازالۃ الادھام ص ۵۷۵ تا ۵۷۸
- (۵) ایضاً ص ۵۳۹
- (۶) ایک غلطی کا ازالہ
- (۷) اربعین نمبر ۴ ص ۷، ۷
- (۸) ایضاً
- (۹) قاری نصیر احمد غزنوی نے اپنی تصنیف ”اظہار حق - قادیانیت اپنے لڑیچر کے آئینے میں“ اس سلسلے میں مرزا قادیانی کے ۲۶ مختلف اقوال کا تذکرہ کیا ہے۔
- (۱۰) مجموعہ اشتہارات ج ۱ ص ۳۱۲ تا ۳۱۴
- (۱۱) حقیقت النبوت، انوار العلوم ج ۲ ص ۴۵۵، ۴۵۶ یہ کتاب مرزا محمود کی تصنیفات کا مجموعہ ہے
- (۱۲) حقیقتہ الوحی ص ۲۸، ۲۷، کشتی نوح ص ۱۵
- (۱۳) تحفہ گولڑویہ ص ۲۱، ۹۴ تا ۱۰۲ تذکرہ الشہادتین ۴۳، ۷۳، ایام صلح ۱۶۸، ۱۶۹
- (ماثیہ)
- (۱۴) انوار خلافت ص ۱۸ تا ۲۳

- (۱۵) حقیقتہ الوحی ص ۹۷ حاشیہ
- (۱۶) چشمہ معرفت ص ۸۲ ، حقیقتہ الوحی ص ۲۸ (حاشیہ) حقیقتہ النبوت انوار العلوم جلد ۲ ص ۵۴۴
- (۱۷) تتمہ حقیقتہ الوحی ص ۸۵
- (۱۸) کیا شرف انسانیت کی انتہا پر فائز تمام شخصیات کا پر تو اور نمونہ ایسا ہو سکتا ہے جو اپنی تیسری شادی کے لئے گیارہ سالہ لڑکی محمدی بیگم کا رشتہ نہ ملنے پر اس کی پھوپھی کو خط لکھے کہ اپنے بھائی کو اور جگہ رشتے دینے سے روکے ورنہ اپنے بیٹے فضل احمد سے تمہاری بیٹی عزت بی بی کی مشروط طلاق نکلواؤں گا کہ جس روز محمدی بیگم کا کسی اور سے نکاح ہوا عزت بی بی کو تین طلاق ہیں اور واقعی طلاق دلوا دی اور تیسری شادی کی کوشش کی مخالفت پر دوسرے بیٹے سلطان احمد کو علق کر دیا اور اشتہار دیا کہ جس روز محمدی بیگم کی دوسری جگہ شادی ہوئی اس نکاح کے دن سے سلطان احمد علق اور محروم الارث ہو گا اور اس روز سے اس کی والدہ پر میری طرف سے طلاق ہے (مجموعہ اشتہارات ص ۲۱۹ تا ۲۲۱ ، سیرۃ المہدی ص ۲۲) اول
- (۱۹) ایک غلطی کا ازالہ
- (۲۰) ملفوظات ج ۶ ص ۶۷
- (۲۱) نشان آسمانی ص ۴۳
- (۲۲) تحفہ گوٹرویہ ص ۷۷ ، ۷۸ روحانی خزائن ج ۱ ص ۲۲۰ ، ۲۲۱
- (۲۳) براہین احمدیہ ضمیمہ ج ۵ ص ۱۳۲
- (۲۴) ایضاً ص ۱۸۲
- (۲۵) فتاویٰ احمدیہ ج ۱ ص ۸۲ - یہ حوالہ محمدیہ پاکٹ بک ص ۵۹۶ سے لیا گیا ہے۔
- (۲۶) احمدیہ تحریک ص ۹۸ از ملک محمد جعفر خان
- (۲۷) تفسیر سورہ فاتحہ ص ۳۱۸ ، ۳۱۹
- (۲۸) تذکرہ (مجموعہ الہامات) ص ۹۰

(۲۹) حذف کے لئے یہ علامت اصل میں اس طرح ہے

(۳۰) تذکرہ ص ۳۷۱

(۳۱) ایضاً ص ۳۹۹

(۳۲) تحفہ گولڑویہ ص ۷۵ روحانی خزائن ج ۱۷ ص ۲۱۵

(۳۳) سورہ المومنون (۲۳) ر ۱۳

(۳۴) ازالۃ اللہام ص ۷۲۲ حاشیہ

(۳۵) تفسیر سورہ فاتحہ ص ۳۱۹

(۳۶) اتفاق دیکھئے مرزا بشیر الدین محمود قادیان سے براستہ رتن بلغ لاہور ربوہ پرنچے

(اخبار الرحمت ۲۱ نومبر ۱۹۳۹ء)

(۳۷) خطبہ جمعہ بحوالہ قادیانی اخبار الرحمت لاہور جلد ۱ ص ۱-۲۱ نومبر ۱۹۳۹ء

۳۶ اور ۳۷ دونوں حوالے قادیانی مذہب (ایڈیشن ششم) کے مقدمہ سے

ماخوذ ہیں۔

(۳۸) خطبہ الہامیہ ص ۲۸، ۱۹

الہامات کی رداؤں میں لپٹے ہوئے افراد کا اصل کردار

قادیانی امت کا قول و فعل مرزا غلام احمد علیہ ما علیہ کے کشوف و الہامات اور ”رویائے صلوٰۃ“ کی طرح بھان متی کی ایک پٹاری ہے اور ان میں اس قدر تضاد و تخالف بلکہ تناقص موجود ہے کہ اس کی کوئی تعبیر کرنا ممکن ہی نہیں۔ نام نہاد الہامات کی رداؤں میں لپٹی ہوئی ”ذرت مشبرہ“ نے ربوہ کی فکر اور شور زدہ سرزمین میں اپنے فکری و نظری بانجھ پن میں اضافہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے فارسی الاصل عجمی ذوق کی تسکین کے لئے بھی ایسی ایسی غی راہیں تلاش کی ہے کہ خانوادہ نبوت کذبہ کی ہر کھلی ہی نہیں اس سے وابستگی اور پیوستگی کا اقرار کرنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد جسے بلاشبہ اس جماعت کا سواد اعظم کہنا چاہئے سدومیت کی ایسی نہج پر چلا ہے کہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ خدا تعالیٰ نے عصمت نبوی ﷺ پر زبان طعن دراز کرنے کے نتیجے میں اہل ربوہ سے عصمت و کردار کا وہ گوہر بھی چھین لیا ہے جو ایک عام آدمی کے ماتھے کا جھومر ہوتا ہے کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ قادیانی امت کے بڑے تو چندے کے استحصالی نظام کو باقاعدہ بحث کی شکل دے کر ہر سال اربوں روپیہ اکٹھا کر لیتے ہیں اس لئے وہ تو فراوانی دولت کے نشے میں بیکاری کے شغل کے طور پر یہ دھندہ اپنا لیتے ہیں لیکن وہ لوگ جنہیں مرزا غلام احمد کو نبی ماننے اور اپنے معاشرے سے کٹ کر ربوہ کے استحصالی نظام کے شکنجے میں جکڑے ہوئے رہنا پڑتا ہے اور اپنی قوت لایموت میں سے بھی جبری بھتہ دینا پڑتا ہے وہ اگر اس عالم میں اپنے سربراہوں بلکہ گورو رجنیشوں کا اتباع نہ کریں تو کیا کریں!

جھوٹ، الزام تراشی، غیبت، دھوکہ دہی اور فریب وہ عناصر خمسہ ہیں جن سے قادیانیت کا خمیر اٹھایا گیا ہے اس لئے اگر اس سے کوئی اور چیز برآمد ہو تو اس پر تعجب ہو گا۔ ہر وہ شخص جس نے چند سال ربوہ میں آنکھیں کھلی رکھ کر گزارے ہیں وہ اس

امر کی شہوت دے گا کہ ربوہ کی معاشرتی اور معاشی زندگی حسن بن صباح کی جعلی جنت کی طرح نل اور بروزی ہی نہیں بلکہ عین بہ عین اس کا بدل ہے۔ براورم جی آر اعوان کو ربوہ کے افکار و نظریات سے کبھی کوئی علاقہ نہیں رہا لیکن انہیں گیارہ سال کا طویل عرصہ چناب کے اس پار گزارنے کا موقع ملا ہے اور ان کے مشاہدات اور تجربات بھی بالکل وہی ہیں جن کا ذکر راقم الحروف نے خاصی تفصیل کے ساتھ شہر سدوم میں کیا ہے اسے محض اتفاق قرار نہیں دیا جاسکتا کہ مرزا غلام احمد کے اپنے زمانے میں بھی میں محمد سراج الحق افغانی نے ان کی پگڑی میں مرزا محمود احمد کے جنسی عصیان کے ایک واقعہ کے بارے میں تحریر لکھ کر محض اتفاقاً ہی رکھ دی اور ازاں بعد اس اتفاق کی ایک جھلک اس وقت نظر آئی جب مولوی محمد علی نے یہ لکھا کہ مرزا محمود احمد پر الزام تو ثابت تھا مگر ہم نے اسے شبہ کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔ اسے مکافات عمل کہنے یا ستم ظریفیء حالات کہ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اسی کسمن حق کی پاداش میں خود مولوی محمد علی اور ان کے اہل خانہ کو قلیان سے در بدر ہونا پڑا۔ اس کے بعد عبدالکرم اور محمد زاہد المعروف مباہلہ والوں نے اپنی بہن سیکینہ بیگم زوجہ آنجنابی مرزا عبدالحق ایڈووکیٹ سرگودھا سے ہونے والی زیادتی پر مرزا محمود احمد کی پاکبازی کی حقیقت کھولنے کے لئے باقاعدہ ایک اخبار ”مباہلہ“ نکالا۔ پھر فخر الدین ملتانی نے اسی صورت حال سے تنگ آکر قلیان کے در و دیوار پر ”فحش کا مرکز“ کی سرنی جما کر اشتہارات لگائے اور اس کے نتیجے میں اسے اپنی جان بھی دینا پڑی۔ حکیم عبدالعزیز نے بھی یہی راہ اپنائی، حقیقت پسند پارٹی کے جنرل سیکرٹری صلاح الدین نے اپنی بہن روزی اور ڈیزی سے ہونے والی زیادتی پر ہا ہا کار مچائی ”خالد احمدیت“ عبدالرحمن خادم مصنف ”احمدیہ پاکٹ بک“ کے بھائی عطاء الرحمن نے اپنی کتاب ”ربوہ کا مذہبی آمر“ میں ایسے ہی خونچکاں حقائق کی نشاندہی کرتے ہوئے ایسے ایسے انکشافات کئے کہ قلیانی خلفاء کا سارا بھرم خاک میں مل کر رہ گیا۔ انہی کے دوسرے بھائی عزیز الرحمن نے سینکڑوں پمفلٹ لکھ کر مرزا محمود احمد اور ان کے ہم مشروں کے قائم کردہ دجلی نظام کی قلعی کھول کر رکھ دی۔

مگر وہ اپنی پرانی تطہیر ذہنی کی بنا پر مرزا غلام احمد کو اب بھی مجدد مسیح موعود اور پتہ نہیں کیا کیا سمجھتے ہیں۔ مگر اس کی جنسی انارکی کے بارے میں کوئی مفاہمت کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بشیر احمد مصری جو مولوی عبدالرحمن مصری کے بیٹے تھے اور جنہوں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر یہ تحریر دی تھی کہ مرزا محمود احمد نے ان سے ”فعل بد“ کا ارتکاب کیا تھا آخری عمر تک اپنے اس موقف پر ڈٹے رہے۔ اور قادیانی امت کے چوتھے گورو مرزا طاہر احمد جب لنڈن گئے تو انہوں نے باقاعدہ ایک پمفلٹ چھاپ کر انہیں مباہلہ کی دعوت دی۔ یہ پمفلٹ میرے پاس بھی موجود ہے جسے جمعیت اہل حدیث نے لنڈن سے از سر نو شائع بھی کر دیا ہے جب کہ اس کی تفصیلات تو ”لولاک“ فیصل آباد میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ جس میں جناب بشیر احمد مصری نے مرزا طاہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جناب علماء کو چیلنج کرنے کی بجائے ہم سے مباہلہ کریں جو آپ کے گھر کے بھیدی ہیں۔ مگر مرزا طاہر احمد اپنے دادا کی سنت کے مطابق راہ فرار اختیار کر گئے کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ ان کے سامنے آنے سے قلیان اور ربوہ کی روحانی شکار گاہ کے ایسے ایسے مناظر سامنے آئیں گے جنہیں عبدالرحمن قادیانی کے بیٹے عبدالرزاق مہتہ کا کمزور قلم بیان کرنے سے عاجز رہ گیا۔ بھائی عبدالرزاق مہتہ تو خیر بدھاپے میں یہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں تھے یہاں تو عصیان کا طوفان اپنی شدت میں اتنا زیادہ ہے کہ اس کو بیان کرنے سے تو ”ڈی ایچ لارنس اور جان رائل اسکٹ“ کا قلم بھی عاجز اور بے بس ہو جاتا ہے۔ جی آر اعوان نے تو ان لوگوں کی بڑی تعداد کو جو روحانیت کے چکر میں ان دلدادگان رومانیت کے ہاتھوں سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تھے شاید دیکھا تک نہیں لیکن وہ بھی یہی بات کہتے ہیں تو پھر اسے محض یہ کہہ کر رو کر دینا ممکن نہیں کہ یہ سب مخالفین کی کارستانی ہے یہاں تو اپنے اور بیگانے سب متفق ہیں اس لئے یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے اور ایسا مشاہدہ اور تجربہ ہے جسے کوئی دلیل باطل نہیں کر سکتی۔ جی آر اعوان نے ربوہ کی معاشی و معاشرتی زندگی کی جو جھلک دکھائی ہے وہ ایک ایسا ناگزیر کام ہے جس سے اب تک صرف نظر کیا جاتا رہا ہے اس

اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی یہ نگارشات بہت بڑے خلا کو پورا کرتی ہیں ان کی یہ کتاب امت مسلمہ کے ہر طبقہ میں ہی ذوق و شوق سے نہیں پڑھی جائے گی بلکہ ربوہ کی سنگلاخ زمینوں میں بھی یہ اپنا اثر چھوڑے گی اور ماہرین نفسیات کے لئے بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔ منور احمد انیس قادیانی نے ملائیشیا کے نائب وزیر اعظم سے سدومیت کا شوق پورا کرنے کا پولیس کے سامنے جس طرح اقرار کیا اور اسے بی بی سی نے ہوا کے دوش پر کہہ ارض پر بسنے والے اربوں لوگوں تک جس انداز میں پہنچا دیا ہے قادیانی شاید اسے بھی مرزا غلام احمد قادیانی کے الہام ”میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا“ کی تکمیل کا ہی پہلو قرار دیں گے۔ لیکن یہ راز اب طشت از بام ہوتا جا رہا ہے کہ قادیان اور اس کے بعد ربوہ میں جتنا بدترین استحصال نظام قائم ہوا ہے اس نے اس جماعت کے نام نہلو سربراہوں کو تو خدمت دین اور خدمت قرآن کے نام پر اکٹھے کئے گئے چندوں سے حاصل ہونے والے اربوں روپے سے اندرون و بیرون ملک کلچرٹے اڑانے کے لئے کھلا چھوڑا ہوا ہے لیکن عام ”احمدی“ جو اپنے مخصوص عقائد و نظریات اور اس میں کئے جانے والے غلو و اطراء اور تشدد کی وجہ سے اپنی برادری اور ماحول سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسے شہر میں جہاں روزگار کے کوئی متبادل ذرائع موجود نہیں وہاں وہ مرزا غلام احمد کے خاندان کو جبری بھستہ دینے پر بھی مجبور ہوتے ہیں اور ان کی چاکری کرنے پر بھی۔ کیونکہ اگر وہ وہاں پر قائم جبر و تشدد کے استحصال نظام کے خلاف آواز احتجاج بلند کریں تو کرایہ پر رہنے والوں کو تو درکنار وہاں مالکن مکان کو بھی چلتا کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ صدر انجمن احمدیہ ربوہ سے صرف ”لیز“ پر زمین حاصل کر سکتے ہیں۔ پہلے تو اس زمین کی رجسٹری بھی ”لیز ہولڈرز“ کے نام نہیں ہوتی تھی گو اب یہ سلسلہ تو کسی حد تک شروع ہو گیا ہے لیکن حکومتی ٹیکس کے اربوں روپے خانوادہ نبوت کا ذبحہ نے جس طرح ”ڈکارے“ ہیں اس کا ابھی تک کوئی حساب نہیں لگایا گیا۔ ربوہ کی زمین ”کراؤن لینڈ ایکٹ“ کے تحت ”علامتی قیمت“ پر صدر انجمن احمدیہ ربوہ کو دی گئی تھی لیکن اسے لاکھوں روپے مرلہ۔ کہ

حساب سے مریدوں کو بیچ کر جس طرح اربوں روپے کمائے گئے ہیں یہ استحصال کی بدترین مثال ہے اور اس کا حکومت کو ازالہ کرنا چاہئے اور نہ سربِ رحشری کے ہضم شدہ ٹیکس ان لوگوں سے وصول کرنے چاہئیں بلکہ اس ”لیز“ کو بھی فوراً منسوخ کر دینا چاہئے۔

قادیان سے تو مولوی محمد علی، خواجہ کمال الدین اور دوسرے قریبی لوگوں کو دہلی کے ”چھٹ بیڑوں“ نے نکلنے پر مجبور کر کے ۲۲ سالہ مرزا محمود احمد کو ایک ایسی عمر میں مرزا غلام احمد کی ”گدی“ پر بٹھانے کی کوشش کی جو دینی جماعتوں کی سربراہی کے لئے کسی طرح مناسب ہی نہیں۔ اس کے بعد مرزا محمود نے بھی جماعت کو ”حوالہ ناصر“ لکھنے کی تلقین کر کے اپنے بڑے بیٹے مرزا ناصر احمد کی تخت نشینی کی راہ ہموار کی اور مرزا رفیع احمد اپنے تمام خضوع و خشوع اور درسوں سمیت سویتلا ہونے کی وجہ سے اس گدی کے قریب بھی نہ چٹک سکے۔ حکیم نور الدین کے بیٹے میاں عبدالمنان کو پہلے ہی جماعت سے نکل کر راستے کا یہ پتھر بھی ہٹا دیا گیا تھا۔ اور ایک مرتبہ جب فلج کے انتہائی کھٹاک لہت میں مرزا محمود احمد نے میاں عبدالمنان کو معافی دینے کا ارادہ کیا اور اس کا ہاتھ جلسہ سلانہ کے موقع پر اعلان کرنے کا پروگرام بھی بنایا تو مرزا ناصر احمد نے پستول تین کر کہا۔

”ابا حضور ایسا ہرگز نہ کرنا ورنہ ———“

اور پھر مرزا محمود احمد اس سے رک گئے۔ کیونکہ آخر یہ سارا ڈرامہ بھی تو انہوں نے مرزا ناصر احمد کو لانے کے لئے ہی رچایا تھا۔ مرزا ناصر احمد نے تخت خلافت پر متمکن ہو کر مرزا رفیع اور اس کے یمن و یار میں رہنے والے لوگوں پر ظلم کی انتہا کر دی تو مرزا طاہر نے فوراً حالات کا جائزہ لیتے ہوئے مرزا رفیع سے اپنے تعلقات توڑ لئے اور مرزا ناصر احمد کے بیٹے مرزا لقمان کو اپنی اکلوتی بیٹی دوسری شادی کے لئے دے کر خاندان میں اپنی پوزیشن مضبوط کر لی اور جب مرزا ناصر احمد اپنے بیٹے مرزا لقمان کے دام میں آئے وہی ”طاہرہ خان“ سے راہ و رسم بھانے اور اپنی مردہ رگوں میں جوانی کا

خون دوڑانے کی کوششوں میں ناکام ہوئے اور خدا تعالیٰ کی گرفت میں آکر ”زگباش“ ہوئے تو مرزا طاہر احمد نے خاندان میں اپنی مضبوط پوزیشن کا فائدہ اٹھا کر خلافت پر قبضہ جمالیا۔ اب ”ایم جی احمد“ کے حق میں پروپیگنڈا ہو رہا ہے اور توقع ہے کہ اگر کوئی غیر معمولی تبدیلی نہ ہوئی تو ”خلافت“ کا حمار اس کے سر پر بیٹھے گا۔ اس کے بعد بھی قادیانی امت یہی ”ڈگڈگی“ بجاتی رہے گی کہ ”یہ خلافت“ ہے گدی نہیں اور امر واقع یہ ہے کہ یہ گدی سے بھی دو قدم آگے رہنے والی ”گدھی“ ہے۔

شفیق مرزا لاہور

روداد الفت

میو ہسپتال لاہور کی غلام گردشوں میں آج بھی میری اور جی آر اعوان کی دوستی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ۱۹ برس قبل ہماری پہلی ملاقات ہسپتال کے انٹرنی بائیوٹیک اور انٹرنی سیٹیک ادویہ کے محکمہ زندہ ماحول میں اس وقت ہوئی جب ہم دونوں وہاں ملازم تھے۔ ایک شفیق اور نستعلیق انسان سے ملاقات ہوتے ہی ہماری دوستی ہو گئی۔ یوں شیر و شکر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے گھریلو 'دفتری' ملل اور سماجی حالات ایک جیسے تھے۔

اتنی طویل دوستی میں جو مشاہدہ میں نے کیا اس کے مطابق اعوان صاحب بڑے مرنجیل مرنج اور ہمہ صفت انسان ہیں۔ خود مصائب کے گرداب میں گھر کر بھی دوسروں کو کنارے لگانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کمشنٹ کا یہ عالم ہے جو وعدہ کریں اسے ایفا کرنا جزو زندگی سمجھتے ہیں۔

اعوان صاحب لاہور میں پیدا ہوئے۔ پرورش اور ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر بھیرہ ضلع سرگودھا کے محلہ اسلامی باغ میں پائی۔ افتاد طبع کا یہ عالم ہے پرائمری تعلیم کے دوران موصوف نے چند دن بھی کسی ایک سکول میں ٹک کر نہیں گزارے کبھی شوکت اسلامیہ سکول میں ہیں تو کبھی ماسٹر سعید کے مدرسے میں، آج چڑی چوگ سکول میں گئے ہیں تو کل اپنے تایا حاجی محمد حیات کے سکول علی پور سیداں میں براہمن ہیں۔ اپنے سرکاری ملازم والد محترم کے ساتھ مختلف شہروں میں بھی رہے اس دوران سلاوالی اور ساہیوال ضلع سرگودھا کے علاوہ لاہور کے کوٹ خواجہ سعید کے سکول میں بھی تفتیاں لکھتے رہے۔ لیکن پرائمری تعلیم کا اصل، طویل اور نتیجہ خیز دور انہوں نے ضیائے امت پیر کرم شاہ کے سکول محمدیہ غوثیہ پرائمری سکول میں ملک نذیر اور صوفی خدا بخش کے زیر تدریس گزارا۔ آپ نے اسی سکول سے مارچ ۱۹۶۵ء کو پانچویں جماعت

پاس کی۔

اعوان صاحب کے والد صاحب کو سرکاری و نجی ملازمت خاص طور پر ”کلرکی“ بالکل پسند نہیں تھی۔ اسی لئے انہوں نے ۱۹۷۳ء میں ریٹائرمنٹ سے قبل ہی چینیوٹ میں سینٹ کی ایجنسی لے کر کاروبار شروع کر دیا جو سابق صدر جنرل ضیاء الحق کے ”فضل و کرم“ سے ۱۹۷۸ء میں کم سنی کے عالم میں ہی دم توڑ گیا۔ ناچار اعوان صاحب کو ملازمت تلاش کرنا پڑی۔ اس سلسلے میں وہ اپریل ۱۹۷۹ء کو لاہور کے بلغ گل بیگم میں آپہنچے اور حالات نے آپ کو میو ہسپتال کا جونیئر کلرک بنا دیا۔ لیکن آپ نے والد کی نصیحت و وصیت کے مطابق خدا کی طرف سے موقع ملتے ہی ”کلرکی“ چھوڑ دی۔ ۱۹۸۱ء میں آپ نے حضرت یونس خان آفریدی ڈبل ایم اے۔ ایل ایل بی، ایف آر جی ایس ایڈووکیٹ لاہور ہائی کورٹ سے بیعت کر لی۔ میں آفریدی صاحب کا مرید تو نہیں تاہم عقیدت مند ضرور رہا ہوں۔ انہیں کے حکم پر ہم دونوں نے ایران کے خانہ فرہنگ مل روڈ پر فارسی کے کورس میں داخلہ لیا۔ کورس کی تکمیل کے بعد جی آر اعوان نے تو ایم اے اردو کر لیا جو میں چاہنے کے باوجود نہیں کر سکا۔ ایک دفعہ آفریدی صاحب نے قلندرانہ ترنگ میں کہا ”اعوان صاحب آپ صحافی کیوں نہیں بن جاتے“ عرض کی ”حضرت وہ کیسے میرا تو اس پیشے سے دور کا بھی واسطہ نہیں“ فرمایا ”ہم نے کہا ہے بن جائیں“۔ بس ادھر آفریدی صاحب کے منہ سے بات نکلی سوئے اتفاق ادھر ڈان اخبار کے سکندر لالی نے اعوان صاحب کو سیارہ ڈائجسٹ میں جزوقتی پروف ریڈر بننے کے لئے بھیج دیا۔ آپ یہاں آئے تو پروف ریڈر کے بجائے مصنف بن کر اولیائے کرام کی چار جلدیں لکھ ڈالیں۔ اور دسمبر ۱۹۸۹ء تک علی سفیان آفاق اور ندیم اہل کی ادارت میں کام کرتے رہے۔

آپ نے آغا شورش کاشمیری کی تمام کتب پڑھی کیا از بر کر رکھی ہیں یہ انہی کا اعجاز ہے کہ جب آپ کوئے صحافت میں آئے تو امروز، اجالا، چار دیواری، حکایت، سیارہ ڈائجسٹ، زندگی، مشرق، نوائے وقت میں لکھتے وقت انہیں کوئی دشواری نہیں

ہوئی۔ جون ۱۹۹۰ء میں روزانہ صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا اور چند دن نوائے وقت اور ایک سال مشرق میں گزارا۔ پھر پاکستان اور خبریں سے ہوتے ہوئے روزنامہ جنگ آہنچے اور تادم تحریر یہیں پر ڈیرے ڈالے بیٹھے ہیں۔

اعوان صاحب نے ”احقوں کی جنت“ لکھنی شروع کی تو میں ڈر گیا انہیں روکا اور کہا بھائی مرزائی بڑے ظالم لوگ ہیں آپ اپنے بچوں کے تنہا کفیل اور وکیل ہیں آپ کو کچھ ہو گیا تو ان کا کون والی وارث ہو گا۔ اس پر انہوں نے کہا ”اگر اسی طرح مرنا لکھا ہے تو پھر ڈرنا کیسا۔“ بہر حال انہوں نے کتاب لکھ ڈالی جسے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوا اعوان صاحب نے کتاب لکھ کر کمال کیا ہے نہ لکھتے تو ملال ہوتا۔

محمد اشرف

ہارٹ میڈیکس جیل روڈ لاہور

۱۰ / اکتوبر ۱۹۹۸ء

غایت تحریر

ہر شخص کے ماضی میں یادوں کا ایک جہاں آباد ہوتا ہے۔ ذہن کا کمپیوٹر آن ہوتے ہی جیتے دنوں کا لمحہ لمحہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ میرے ایام رفتہ بھی یادوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بے شمار تلخ و شیریں یادیں بھلائے نہیں بھولتیں۔ پھر قدرت نے امتحانی کمال کا حافظہ دیا ہے کہ اک ذرا غور کی دیر ہے گئے دنوں کی ہر بات یوں یاد آنے لگتی ہے جیسے مسافت سٹ مگنی ہو اور گزرا زمانہ لوٹ آیا ہو۔ بچپن کی یادیں تو ویسے بھی لا شعور کے نمل خانوں میں ایسے جاگزیں ہوتی ہیں کہ انسان زندگی میں جب بھی خواب دیکھتا ہے 'تو خود کو اسی گھر میں دیکھتا ہے' جہاں اس نے بچپن گزارا ہوتا ہے۔

میرا بچپن نور لاکھی کفر کی بستی "مرزائیل" میں گزرا جسے ربوہ کہا جاتا ہے۔ مرزائیل نور یسویوں میں ہر اعتبار سے اس قدر مماثلت ہے کہ ربوہ کو اسرائیل کے ہم وزن مرزائیل کہا جاتا تھا۔ ہم کتب کے نام "محققوں کی جنت" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسلمان جنت کے لئے اہل "لوصاف" اور افضل کو باکمال بناتا ہے جب کہ مرزائی پیغمبر کی جنت کے گٹ کے خواہشمند کو اپنی محلولہ و غیر محلولہ جائیداد کے ایک چوتھائی حصہ کے برابر رقم جماعت کو دینا پڑتی ہے۔ لہذا اہل کی بجائے مل سے جنت حاصل کرنے والوں کے شر کو "محققوں کی جنت" ہی کہا جاسکتا ہے۔ ویسے کتب کے آخر میں ڈاکٹر سید اعجاز الحسن شہ کا حقیقی مضمون ربوہ کے نام کے متعلق بے شمار وضاحتوں کا حامل ہے جس کے مطابق مرزائیوں کے اس شر کو ربوہ کے علاوہ کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے۔

۱۹۶۵ء میں میرے والد گرامی سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں ربوہ تبدیل ہوئے تو ہمیں اپریل ۱۹۶۵ء سے اگست ۱۹۶۹ء تک ربوہ میں رہنا پڑا۔ بعد ازاں اگرچہ

قیام چنیوٹ میں رہا، تاہم تعلیمی تعلق کے حوالے سے دسمبر ۱۹۷۵ء تک مرزا نیل سے ہی وابستگی رہی۔ اس دوران وہاں کی شہری، محض سماجی زندگی اور مرزائی روایات کے بے شمار مشاہدات سامنے آئے۔

مرزائی قوم ایک جھوٹے نبی کی امت ہونے کے باعث مسلمانوں کے لئے جس قدر ناپسندیدہ اور مکروہ ہے، اس سے کہیں زیادہ ان کی زندگی میں پھیلے ہوئے اخلاقی اور سماجی طاعون کو دیکھ کر سرچکراتا اور ذہن سوچتا ہے کہ یہ لوگ ہیں کیا اور خود کو پیش کیا کرتے ہیں۔ اخلاق کی چادر اوڑھے یہ گروہ یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر خصائل کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

قیام ربوہ کے دوران بے شمار مرزائیوں سے ملاقات ہوئی۔ کئی دوست بنے، لاتعداد کلاس فیلو بھی تھے۔ ان کے مذہبی اجتماعات بھی دیکھے۔ کئی مرزائی بے زاروں سے مرزائی امت کے ارباب حل و عقد کی داخلی زندگی کے رنگین و سادہ قصے بھی سنے۔ ”جنت و دوزخ“ اور ”حور و غلمان“ کی کہانیاں بھی معلوم ہوئیں لیکن ان سب سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا کہ مرزائیوں میں مسلمانوں کے لئے تعصب اور تفرقہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

ربوہ میں قیام کے دوران جو دیکھا اور محسوس کیا وہ سب وقت کی دھول اور مصروفیت کی گرد تلی دقتا چلا گیا۔ قلم و کلمذ سے رشتہ ہونے کے باوجود کبھی بھولے سے بھی یہ خیال ذہن میں نہیں آیا کہ کفرستان میں قیام کی روداد پر خامہ فرسائی کی جائے۔ چند برس پہلے ایک روز اپنے ایک جاننے والے کے گھر بیٹھا تھا۔ ان کے ہاں ڈش نصب تھی۔ ٹیلی ویژن آن تھا۔ چینل بدلتے ہوئے اچانک ”احمدیہ ٹیلی ویژن نیٹ ورک“ آگیا جس پر مرزا طاہر کا نام نماوجہ کا خطبہ نشر ہو رہا تھا۔ موصوف کا کہنا تھا کہ ”پاکستان میں ہم جن قاتل تعزیر جرائم کی زد میں آتے ہیں، ان میں ہمارے گھروں سے قرآن کا برآمد ہونا، کسی کو السلام علیکم کہنا یا نماز پڑھنا شامل ہے۔ جبکہ پاکستانی علماء اغواء، بد فعلی، زیادتی اور ناجائز اسلحہ رکھنے کے جرائم میں دھرے جاتے ہیں۔ موازنہ کیا جائے

کہ قصور وار اور جرم دار کون ہے؟“۔

مرزا طاہر کی طرف سے جس ڈھٹائی سے خود کو معصوم اور پاکستانی علمائے کرام کو مطعون کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی، اسے سن کر میری سوئی ہوئی یادوں نے، انگڑائی لی اور قیام ربوہ کے دوران دیکھے ہوئے مرزائیوں کے کئی ”کالے کرتوت“ یاد آنے لگے اور بے اختیار چہا کہ کاش یہ شخص میرے سامنے ہوتا تو میں اس کا اور اس کی امت کا کچا چٹھا اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا۔ میرے پاس کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا۔ چنانچہ یہ خواہش دل ہی دل میں رہ گئی۔ لیکن قدرت کو شاید میرے جذبے پر کچھ زیادہ ہی پیار آگیا۔ اس لئے اس نے مرزائیوں کو آئینہ دکھانے کے لئے مجھے جلد موقع فراہم کر دیا۔

علامہ انور طاہر صاحب میرے مشفق اور مہربان دوست ہیں۔ ایک شب پریس کلب میں ان کے ہمراہ کھانا کھا رہا تھا کہ انہیں ملنے کے لئے محمد طاہر رزاق صاحب تشریف لائے۔ مرزائیت کے خلاف طاہر صاحب کے جہاد کے تذکرے کے بعد علامہ صاحب نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ”اعوان صاحب گیارہ برس ربوہ نشین رہے ہیں“۔ طاہر صاحب سے گفتگو شروع ہوئی تو میں نے انہیں قیام ربوہ کے مختلف واقعات سنائے جس پر طاہر صاحب نے مجھے اس بارے میں یادداشتیں تحریر کرنے کے لئے کہا جس سے ربوہ کی عام شخصی زندگی سے پردہ اٹھتا ہو۔

علامہ صاحب کی تحریک اور محمد طاہر رزاق صاحب کی تائید سے میرا قلم متحرک ہوا اور یہ کتاب شروع کر دی گئی۔ کتاب کیا ہے، ربوہ میں قیام کا روزنامہ ہے جو چھٹی جماعت سے بی۔ اے تک ایک طالب علم کی سال بہ سال کی یادوں اور محسوسات کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں کسی تصنع و بناوٹ کا سہارا لیے بغیر اس زمانے میں آنکھوں نے جو دیکھا اور دماغ نے جو محسوس کیا، وہ لکھ ڈالا۔

کتاب مرزائیت کے خلاف ضرور ہے لیکن اس میں مخالفت برائے مخالفت کا عنصر کمیں بھی نہیں۔ تاہم رسالت اور ختم نبوت کے فلسفے سے محبت کا اثر بہر حال

موجود ہے۔ جو ہر مسلمان کے ایمان کا اقتضا ہے کہ جو شخص بھی ہمارے پیغمبر آخر، پیغمبر اعظم ﷺ کے کاشانہ نبوت میں نقب لگائے وہ مسلمہ کذاب ہو یا قلدیان کا مرزا غلام احمد اس سے نفرت اور جنگ ضرور کی جائے گی۔

چنانچہ ربوہ اور اس کے مرزائی کمینوں کے بارے میں میرے ذہن میں جو جملہ محفوظ تھا، میں نے جملہ سمجھ کر محض اس وجہ سے لکھ ڈالا کہ ”مرزا غلام احمد“ کو جملہ سے نفرت تھی۔ میری اس کتاب کو پڑھ کر اگر ایک مرزائی بھی مرزائیت سے متنفر ہو کر تائب ہو جاتا ہے تو یہ میری فلاح کا باعث ہو گا۔

کتاب کی تیاری میں میرے قلم و ذہن کا جتنا دخل ہے، اس سے کہیں زیادہ علامہ صاحب کی رہنمائی اور طاہر رزاق صاحب کے مفید مشورے شامل ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب طاہر رزاق صاحب اور علامہ صاحب کی مساعی منکور کا نتیجہ ہے تو غلط نہیں ہو گا۔

ناقدری الفت ہو گی کہ یہ سطور شفیق مرزا صاحب کے ذکر سے خالی رہیں۔ کہنہ مشق صحافی، دانشور اور صاحب علم مرزا صاحب نے مرزائیت کے رگ و ریشے کی جراحت جس طرح کی ہے اس کی شاہد تو ”شہر سدوم“ ہے تاہم احمقوں کی جنت، انہوں نے حرف حرف پڑھی اور بہت سے ایسے نکات سے آگاہ کیا جن سے ناآشنائی، نارسائی اور ناآگاہی کے باعث یہ کتاب ادھوری اور ناوک تنقید کا نشانہ بنتی۔ روداد الفت میں عزیز من اشرف صاحب نے سوانحی خاکہ بیان کرتے ہوئے میری بہت تعریف کی ہے یہ ان کی نوازش ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

کتاب میں مختلف تذکروں کے دوران مرزائی شہریوں، محلوں اور مقامات کے نام مصلحتاً تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔

ویرانی سی ویرانی

۱۹۶۵ء کے شروع کی بات ہے، ہم ساہیوال ضلع سرگودھا میں رہتے تھے کہ ابا جی کا تبادلہ ربوہ ہو گیا۔ وہ محکمہ زراعت میں ملازمت کرتے تھے۔ ہمارا آبائی شہر بھیرہ ضلع سرگودھا ہے۔ بھیرہ جہاں اولیا خیز سر زمین ہے، وہاں مرزائیوں کا گڑھ بھی ہے۔ مرزا قلوبانی کا پہلا خلیفہ حکیم نور الدین بھی بھیرہ کا ہی رہنے والا تھا۔ جس نے ”مرزا غلام احمد“ کی جھوٹی نبوت کو چار چاند لگائے۔ انہی دنوں ہماری پھوپھی زاد بہن کی شادی تھی، جس میں شرکت کے لئے ہم ساہیوال سے بھیرہ آئے تو وہاں کے مرزائیوں نے ہمارے گھر میلہ لگا دیا۔ ان لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ ہم ربوہ جا رہے ہیں تو ان کی خوشیاں دیدنی تھیں۔ حافظ اشرف، اعلیٰ خدیجہ، مبارک بک سیر، بشارت چکی والا، مبارک درزن غرض ہر مرزائی شخص ہمیں ملنے آیا۔ یہ لوگ یوں مل رہے تھے جیسے ہم حج یا عمرہ کرنے دیار حبیب ﷺ جا رہے ہوں۔ تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان مرزائیوں کی اس وارفتگی کی غایت کیا ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ان کے پاؤں زمین پر اس لئے نہیں ”ٹک“ رہے کہ ان کے خیال میں ربوہ جا کر ہم لوگ مرزائی ہو جائیں گے۔

میں نے پانچویں جماعت ساہیوال میں مفتی صاحب کے سکول میں پڑھی تاہم امتحان پیر کرم شاہ صاحب کے محمدیہ غوثیہ پرائمری سکول بھیرہ سے پاس کیا تھا۔ مزید تعلیم کے لئے چھٹی جماعت میں ربوہ جا کر داخلہ لیتا تھا۔ جن دنوں کا یہ ذکر ہے، تب مرزائیوں کو کافر تو سمجھا جاتا تھا لیکن ملکی قانون کے اعتبار سے وہ غیر مسلم نہیں تھے۔ انہیں عام طور پر مسلمانوں کے ہی ایک فرقے جیسی حیثیت حاصل تھی۔ لہذا مرزائیوں سے میل جول، لین دین اور کھانا پینا اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بھیرہ کے مرزائی نشینوں نے ابا جی کو اپنے ربوہ مکین عزیزوں اور رشتہ داروں کے حوالے اور پتے دیے،

بلکہ اپنے عزیزوں کو ان لوگوں نے خطوط کے ذریعے ہماری آمد کے بارے میں مطلع بھی کر دیا۔ چنانچہ جب ہم ربوہ آئے تو وہ سب ہمارے منہتر اور چشم براہ تھے۔

ہم لوگ ابھی بھیرہ میں ہی تھے کہ ابا جی چارج سنبھالنے ربوہ چلے گئے۔ وہاں جا کر انہیں معلوم ہوا کہ مرزائی انتظامیہ، امت اور جھوٹی نبوت کا دعویدار مرزائی خاندان مسلمان سرکاری ملازمین کو صرف اسی صورت میں ربوہ میں نکلنے دیتا ہے، اگر وہ ان کی بات مانتے رہیں۔ بصورت دیگر ان کا تہلولہ کروا دیا جاتا ہے۔ ابا جی کے پیش رو کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ربوہ میں قیام اور مرزائیوں کو ٹھکانے پر رکھنے کے لئے ٹھوس حکمت عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی سب سے پہلی ملاقات تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل مرزا ناصر احمد سے ہوئی، جو بعد میں مرزائیوں کے تیسرے خلیفہ بنے۔

محکمہ زراعت کا دفتر اور متعلقہ آفیسری رہائش گاہ شہر سے دور دریائے چناب کے پاس تھی۔ کیونکہ شہر میں کوئی شخص مرزائی مرکز کی اجازت کے بغیر رہائش نہیں رکھ سکتا تھا۔ ابا جی نے سب سے پہلے دفتر اور رہائش شہر میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ شہر میں رہ کر وہ تمام حقوق حاصل کرنا چاہتے تھے جو ایک پاکستانی شہری کا حق ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا یہ بھی مقصد تھا کہ مرزائیت کو قریب سے دیکھا جاسکے۔

ابا جی نے مرزا ناصر احمد سے ملاقات کر کے بتایا کہ وہ اپنا دفتر اور رہائش شہر میں رکھیں گے اور سرکاری ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے ان سے محکمہ تعاون کرتے رہیں گے۔ لیکن ربوہ میں قیام کے دوران اپنی نجی اور مذہبی زندگی میں کوئی مداخلت برداشت نہیں کریں گے۔ مرزا ناصر احمد نے ابا جی کو بتایا کہ آپ سے پہلے اکثر زراعت آفیسر ہم سے تعاون نہیں کرتے رہے لہذا ہمیں اپنے زرعی مسائل اور فصلوں اور باغات کی نگہداشت کے لئے ذاتی زرعی عملہ رکھنا پڑا۔ آپ ہمیں محکمہ تعاون فراہم کریں تو ہمارا وعدہ ہے کہ آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، ربوہ میں کسی مسلمان کے لئے گھر حاصل کرنا جو بے

شیر لانے کے مترادف تھا۔ لہذا ہمیں بھی ذاتی طور پر کسی مرزائی سے کرائے کا گھر نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ مرزا ناصر نے ابا جی کو شہر میں رہائش اور دفتر کے لئے ایک کشادہ مکان لے کر دیا۔

اپریل ۱۹۶۵ء کے آخری ایام تھے جب ہم بھیرہ سے عازم ربوہ ہوئے۔ لاہور جاتے ہوئے کئی بار ربوہ کا نام سنا لیکن اس روز ہم اسے دیکھنے اور وہاں رہنے پہلی بار جا رہے تھے۔ مغرب کی نماز سے کچھ دیر پہلے ہم نے پہاڑوں کے دامن میں واقع وادی کفرستل میں پہلا قدم رکھا۔ بس ایک ویران سی جگہ پر رکی۔ ہمارا سامان اتارا اور روانہ ہو گئی۔ اس وقت ربوہ کا لاری اڈہ مرزائیوں کے ”قصر خلافت اور مسجد مبارک“ کے پاس ہوتا تھا۔ اڈے پر ایک چوگٹی محرر اور ایک قلی نما شخص تھا، جس کا نام غالباً ”سیف الرحمن“ تھا۔ باقی ہر طرف ”ہو“ کا عالم اور کوئی ویرانی سے ویرانی تھی۔

میں، میرے بہن بھائی اور امی جان اڈے پر حیران کھڑے سوچ رہے تھے ”یا رب یہ کیسی بستی ہے جہاں بندہ نہ بندے کی ذات“ سب ابا جی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں ”آپ ہمیں کہاں لے آئے ہیں؟“۔

کلنی دیر بعد دور سے ایک ٹانگہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ جب وہ اڈے پر پہنچا تو ابا جی نے اسے ”محلہ دار الرحمت غربی، الفضل والی گلی“ چلنے کو کہا۔ کوچوان نے سامان ٹانگے میں رکھا۔ ہم سوار ہوئے اور ٹانگہ واپس سرگودھا کی طرف چل پڑا۔ سڑک کے دائیں جانب تو صرف پہاڑ ہی پہاڑ تھے جبکہ بائیں جانب خار دار درختوں کے پار ایک جیسی کوٹھیوں کی قطاریں تھیں۔ جن میں بیشتر کے در و دیوار سفید اور سبز تھے۔ کوئی ڈیڑھ میل کی مسافت کے بعد ٹانگہ محلہ دار الصدر کی عقبی سڑک سے شہر میں داخل ہوا۔ اس نیم پختہ سڑک کا نام تو اب میرے ذہن میں نہیں، تاہم سرگودھا کی طرف شہر کی یہ آخری سڑک تھی۔ مکانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو راستے میں کئی مکین بھی نظر آئے۔ عجیب و غریب شکلوں والے لوگ تھے۔ یوں لگتا تھا ہم کسی اور ہی ملک میں آگئے ہیں۔ مختلف گھروں کی دیواروں پر کچھ عبارات تحریر تھیں جن کے نیچے الہام

حضرت مسیح موعود لکھا ہوا تھا۔

ان عبارات میں سے کچھ یوں تھیں :

”مرزا غلام احمد کی ہے“

”بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے“

تائنگے کا گھوڑا مرل، تائنگہ کھنارا اور کوچوان عجیب بیوست زدہ تھا۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک نے تو ہمارے انجر پنجر ہلا کر رکھ دیے اور بالاخر ہم الفضل والی گلی کے اس مکان کے سامنے آ پہنچے جس پر لگی ہوئی سنگ مرمر کی تختی پر ”امین منزل“ لکھا ہوا تھا۔ یہ گلی ربوہ کے مغربی کنارے کی آخری گلیوں میں سے تھی۔ اس کے بعد صرف ایک گلی تھی، جس کے دوسری طرف کافی دور ایک گاؤں نما آبادی تھی جسے ”چمن عباس“ کہتے ہیں۔

گھر خاصا کھلا اور بڑا تھا۔ ہمیں گھر چھوڑ کر اباجی بازار سے کھانا وغیرہ لینے چلے گئے۔ کھانا کھا کر ہم چارپائیوں پر دراز ہو گئے۔ ہم میں سے ہر ایک سوال پر سوال کر رہا تھا کہ ”ہم کہاں آ گئے ہیں؟ یہ تو ویران سا شہر ہے۔ ہمارا دل یہاں کیسے لگے گا؟“ تھکے ہوئے اباجی نے یہ کہہ کر ہم سے جان چھڑائی کہ ”صبح ہو لینے دو آپ لوگوں کی تمام حیرانیاں اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔“ تھکے ہوئے تو خیر ہم تھے، تھوڑی ہی دیر بعد نیند کی وادیوں میں گم ہو گئے۔ اگلے روز اٹھے تو سب سے پہلے میرے کانوں نے جو سنا وہ ایک گونج دار آواز تھی:

”چھوٹے بڑے پوٹے“

اباجی نے مجھ سے کہا ”یہ آواز سنی ہے؟“ کہا ”جی سنی ہے“ اس پر انہوں نے بتایا ہمارے گھر کے ساتھ ہی ایک بازار ہے۔ جس کو غلہ منڈی یا رحمت بازار کہا جاتا ہے۔ یہ آواز وہاں سے آئی ہے۔ پھر انہوں نے ہمیں گھر اور اس کے حدود اربعہ کے متعلق بتایا ”اس محلے کا نام دار الرحمت غربی اور سڑک نما گلی کا نام الفضل والی گلی ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ربوہ سے مرزائیوں کا ایک اخبار بھی شائع ہوتا ہے جس کا

نام ”الفضل“ ہے۔ اس کا دفتر اسی گلی میں ہے جب کہ چمن عباس میں زیادہ تر اہل تشیع بستے ہیں۔ تاہم وہاں چنگڑ قوم بھی آباد ہے۔ شہر کے بارے میں انہوں نے مزید بتایا کہ ربوہ میں سب سے بڑا گول بازار ہے جب کہ ایک کچا بازار بھی ہے۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ مجھے بازار لے گئے۔ بازار اور لوگوں کو دیکھ کر کچھ تسلی ہوئی کہ یہاں بھی کوئی رہتا ہے۔

الفضل والی جس گلی میں ہمارا گھر تھا، اس کے ایک طرف مستری فضل دین سائبیریا والے، دوسری طرف ٹاؤن کمیٹی ربوہ کے سیکرٹری نور احمد عابد، تیسری طرف ابراہیم پہلوان رہتے تھے جبکہ چوتھی جانب سڑک تھی اور اس کے پار کھلا میدان تھا۔ جس کی ایک طرف چاچا محمد حسین اور بابا اہل جل کا گھر تھا۔ جب کہ اس کے ساتھ ہی چودھری سر بلند خان کا گھر تھا۔ ہمارے گھر پر نصب ”امین منزل“ کی تختی دراصل مالک مکان محمد امین زرگر کے نام سے موسوم تھی جو سیالکوٹ میں رہتے تھے اور صرف مرزائیوں کے جلسہ سالانہ پر ہی وہ ربوہ آیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ اس گلی میں زیادہ تر متوسط طبقے کے ملازم پیشہ اور محنت مزدوری کرنے والے مرزائی آباد تھے۔ مسلمانوں کا صرف ایک گھر تھا اور وہ ہمارا تھا۔ تاہم گلی میں ایک قاتل ذکر شخصیت صوفی بشارت الرحمن رہتے تھے جو عربی کے پروفیسر تھے جو بعد ازاں تعلیم الاسلام کالج کے وائس پرنسپل بھی بنے۔ صوفی صاحب کو نہ جانے کیا بیماری تھی کہ وہ اپنے گھر سے نکلتے ہی کھٹکھٹانا شروع کرتے اور منزل مقصود تک پہنچنے تک یہ عمل جاری رکھتے۔ ان کی یہ عادت ان کے گھر سے باہر نکلنے کا اعلان ہوتی تھی۔

پینے پر کوئی پابندی نہیں

ربوہ میں بس کے ذریعے آئیں تو سڑک کی ایک جانب پہاڑ ہی پہاڑ اور ان کے دامن میں مرزائیوں کا جنت دونخ ہے۔ جبکہ دوسری جانب دریائے چناب تک شہر آباد ہے۔ تاہم دریا کے قریب سڑک کے دونوں جانب آبپایاں ہیں۔ پرانے اڈے سے شہر کی طرف داخل ہوں تو ایک طرف قصر خلافت اور اس سے ملحقہ ”پوش علاقہ“ ہے۔ لاری اڈے سے شہر آنے والی یہ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ جس کے ایک حصے پر قصر خلافت جامعہ نصرت کلج و نصرت گرلز ہائی سکول ہے اور دوسری جانب یہی سڑک امور عامہ اور تحریک جدید کے دفاتر کے سامنے سے گزرتی ہوئی گول بازار میں داخل ہو جاتی ہے۔ گول بازار بھی دراصل گول نہیں بلکہ درانتی کی مانند آدھا گول ہے۔ اب تو شہر کی شکل بدل چکی ہے، تاہم ۱۹۶۵ء میں اس کی صورت ایسی ہی تھی، جیسی بتلائی جا رہی ہے۔ دکانوں کا سلسلہ منان ٹیلر کی دکان سے شروع ہو کر زیرہ ہاؤس پر ختم ہوتا تھا۔ زیرہ ہاؤس کے سامنے سے ایک سڑک گزرتی ہے جو ریلوے پھانک کو کراس کرتی ہوئی شہر کے دوسرے حصے کی طرف جاتی ہے۔ جس پر فضل عمر ہسپتال، ٹیلی فون ایکسچینج اور تنویر سٹوڈیو وغیرہ آتے ہیں۔ ریلوے لائن شہر کے وسط میں سے گزرتی ہے جس کے ساتھ ساتھ جانے والی ریلوے روڈ دریا کی طرف اور غلہ منڈی اور فیکٹری ایریا کی طرف جاتی ہے۔ دریا کی طرف جانے والی اسی سڑک پر جامعہ احمدیہ، تعلیم الاسلام ہائی سکول اور تعلیم الاسلام کلج ہیں۔

ربوہ کی تمام گلیاں کشادہ اور سڑک نما ہیں۔ تب گلیاں تو کچی تھیں تاہم ریلوے اسٹیشن اور لاری اڈے سے شہر کے مختلف حصوں کو جانے والی اور قصر خلافت اور اس سے ملحقہ علاقے کی سڑکیں نیم پختہ تھیں۔ انہیں تارکول ڈال کر پختہ بنانے کی بجائے ان پر موٹی بجری ڈال کر اوپر سرخ کیری بچھا کر پختہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

یہ سڑکیں بھی ”مرزا غلام احمد“ کی نبوت کی طرح جعلی تھیں جن کی قلعی بارش ہوتی ہی کھل جاتی۔ ان پر پڑی ہوئی ”سرخ گیری“ لال یکچڑ بن کر لوگوں کے کپڑوں پر نقش و نگار بنا دیا کرتی تھی۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی کہ جعلی خاندان نبوت نے انتہائی متمول و مالدار ہونے کے باوجود سڑکوں کی تعمیر پر توجہ کیوں نہیں دی تھی۔

ربوہ کے تمام داخلی راستوں پر بڑے بڑے سائز کے بورڈ آویزاں تھے جن پر جلی حروف میں ”سگریٹ نوشی ممنوع ہے“ لکھا ہوا تھا۔ یہاں آنے والے اجنبی ان بورڈوں کو پڑھ کر اکثر سگریٹ پھینک یا جیبوں میں اچھی طرح چھپا دیا کرتے تھے۔ میں نے شہر میں پھرتے ہوئے دیکھا کہ ہر کریانے کی دکان پر نہ صرف سگریٹ فروخت ہوتے بلکہ چلتے پھرتے لوگ سگریٹ پیتے بھی نظر آتے تھے۔ جبکہ پان سگریٹ کے کئی کھوکھے بھی تھے۔ گول بازار میں پان سگریٹ کی سب سے بڑی دکان ”نہیم موٹے“ کی تھی۔ اس سلسلے میں لوگوں سے پوچھا گیا کہ جب شہر میں سگریٹ نوشی ممنوع ہے تو یہاں سگریٹ کی دکانیں کیوں ہیں۔ بتایا گیا کہ سرعام سگریٹ پینا منع ہے۔ گھروں کے اندر سگریٹ، حقہ اور بیڑی پی جاسکتی ہے۔ بعد میں پتہ چلا یار لوگ پینے والی بہت سی چیزیں چھپ کر پی لیں تو ان پر کوئی گرفت نہیں ہوتی تھی۔ جب سرعام سگریٹ پینے والوں کا ذکر کیا گیا تو ایک شرمندہ سے تبسم کے علاوہ کوئی جواب نہ مل سکا۔

ربوہ میں اردو کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی تھے جن کے والد مولوی احمد خان نسیم مرزائی مبلغ تھے جو پاکستان بھر کے دیہات کے دورے کر کے سادہ لوح دیہاتیوں کو گھیر گھار کر مرزائی بناتے تھے۔ ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی ”تپنی“ کے سگریٹ پیتے تھے۔ ان کے لئے شہر کا ایک مخصوص دکان دار خصوصی طور پر اس برانڈ کے سگریٹ منگوایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر پروازی جامعہ احمدیہ کے کواٹروں میں رہتے تھے۔ ریلوے لائن کے کنارے کنارے چلتے ہوئے جب وہ تعلیم الاسلام کالج پڑھانے جاتے تو کھلے عام سگریٹ پیتے ہوئے جاتے تھے جب کہ ایم ایم احمد کے بھائی، سٹری کے پروفیسر مرزا مجید عرف میاں موچی تو کار میں آتے جاتے، کلاس پڑھاتے وقت اور سرعام بھی

”پاپ“ منہ میں ٹھونسنے رکھتے تھے۔ شہر میں سگریٹ نوشی کی جتنی ممانعت تھی، اتنی زیادہ سگریٹ کی فروخت ہوتی تھی۔ مرزائیت کو میرا نارسا ذہن تو پہلے ہی سمجھتا تھا، مگر سگریٹ نوشی کے متعلق ان کی دو رنگی نے ”مرزا غلام احمد“ کی نبوت کا فلسفہ مزید واضح کر دیا کہ مرزائیت منافقت آگیاں اور دو نمبر مذہب ہے۔

ربوہ میں تمام مکانوں کی ترتیب اور نقشے ایک جیسے ہیں۔ یعنی ایک گلی کے مکانوں کا عقبی حصہ دوسری گلی کے مکانوں کے عقبی حصے کے ساتھ ملتا تھا۔ تمام مکانوں کی تعمیر ”ایل“ کی شکل میں کی ہوئی تھی جب کہ ہر گھر میں ایک درخت بھی لگا ہوتا تھا۔ ان دنوں ربوہ میں ٹیلی فون ایکسچینج لگے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ چنانچہ مرزائی مرکز کے حکم پر اکثر و بیشتر مرزائیوں کے گھروں میں ٹیلی فون تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ہی ربوہ میں سوئی گیس کی تنصیب ہوئی تو مرزائی امت اس وقت سوئی گیس کی سہولت سے مستفید ہوئی جب ملک کے باقی عوام اس سے محروم تھے۔

ربوہ میں ہر چھوٹے بڑے شخص نے ٹوپی پن رکھی ہوتی تھی جسے دیکھ کر بہت حیرت ہوتی تھی۔ ٹوپوں کی اقسام مختلف تھیں۔ تاہم ہر سر رام پوری، جناح اور لیاقت کیپ سے ڈھکا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ ننگے سر پھرنا ”مرزا غلام احمد“ کے حکم کے منافی ہے۔ چنانچہ تمام مرزائی امت ہر وقت ٹوپی پہنے رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ ربوہ کے ہر شہری نے عجیب و غریب ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ عام طور پر ڈاڑھی سے انسان کا چہرہ نورانی ہو جاتا ہے لیکن مرزائی لوگوں کی صرف ٹھوڑی پر لٹکی ہوئی ڈاڑھی نے تو ان کے حلقے ہی بگاڑ کر رکھ دیئے تھے۔ ہر شخص انتہائی کمزور صورت لگتا۔ پتہ چلانے پر بتایا گیا کہ یہ فریج کٹ ڈاڑھی ہے جو مرزائی امت اپنے لئے مسنون سمجھتی ہے۔

”رحمت بازار غلہ منڈی“ میں لاہور ہاؤس، شاہد کلاتھ ہاؤس، بھٹی چیپ شہور، سلیم درائٹی ہاؤس، نعیم پچی ہاؤس اور دارالخیر جنرل شہور بہت مشہور دکانیں تھیں۔ دکاندار تو سارے ہی مرزائی اور اپنے ”نبی“ کی طرح بڑے طرار تھے لیکن شاہد کلاتھ ہاؤس اور دارالخیر جنرل شہور والے سب پر بازی لے گئے تھے۔ یہ دونوں ہاتھوں سے

لوٹتے بھی تھے اور ان کی دکانوں میں حوروں کی بھیڑ بھی لگی رہتی تھی۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ دارالخیر جنرل سنور کے مالک امین کی بیوی معمولی شکل و صورت کی خاتون تھی۔ اس کے ایک دوست نے اس کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو امین نے بے نیازی سے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شہر کی ہر ماہ جبین تو میری جیب اور دکان پر ہوتی ہے۔ گول بازار میں بھی بہت سی دکانیں تھیں لیکن مون لائٹ جنرل سنور، بیت اللباس اور احمدیہ ماڈرن سنور قابل ذکر ہیں۔ مون لائٹ جنرل سنور کے مالک کو ”پیر جی“ کہتے تھے۔ یہ شخص نہایت اچھا آدمی تھا۔ شنید ہے کہ وہ اندر خانے مسلمان ہو گیا تھا تاہم بعد میں ربوہ کے قریب ہی ایک حادثے میں انتقال کر گیا تھا۔ لیکن احمدیہ ماڈرن سنور جو ایک ڈیمپارٹمنٹل سنور تھا، اس کا مالک تو اول درجے کا بے ایمان تھا۔ مرزائی امت اس دکان کو احمدیہ ماور ——— سنور کہا کرتی تھی۔

ربوہ میں آمد کے ایک دو روز بعد میں نے ابا جی کے ہمراہ مختلف دکانوں سے شاپنگ کی۔ کتابیں اور یونیفارم خریدا۔ ربوہ کے بازاروں میں نور کاجل اور ”الیس اللہ“ کی انگوٹھیوں کے بہت سے اشتہاری بورڈ لگے ہوئے تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ انگوٹھیاں تو ”مرزا غلام احمد“ کے المام پر مبنی ہیں جب کہ کاجل خلیفہ اول نور الدین کے کیمیائی نسخوں میں سے تھا۔ ”الیس اللہ“ کی انگوٹھیاں مرزائی امت خیر و برکت کے طور پر پہنتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں ٹوپی، فرنج کٹ ڈاڑھی کے بعد مرزائیوں کا ٹیڈ مارک یہ انگوٹھیاں تھیں۔

ہماری گلی کی آخری ککڑ پر الفضل اخبار کا دفتر تھا۔ یہ روز نامہ کم اور مرزائی نامہ زیادہ تھا۔ جس کی پیشانی کے ساتھ مرزائی خلیفہ کی صحت کی تازہ ترین تفصیلات کے ساتھ روزانہ اس کی درازی عمر کی دعا کے لئے امت سے درخواست کی جاتی تھی۔ اخبار کے ایڈیٹر کا نام روشن دین تنویر تھا۔ اس نام پر ہم لوگ ہنسا کرتے تھے کہ موصوف روشن بھی ہیں اور تنویر بھی۔ اخبارات کے دفاتر کا خاصا ہے کہ اس کے اندر گھما گھمی ہوتی ہے۔ نیوز روم میں سب ایڈیٹر اور رپورٹنگ روم میں رپورٹر ہوتے ہیں

لیکن اس دفتر میں روشن دین بتویر، ایک آدھ کاتب اور دو ایک دیگر افراد کے علاوہ ویرانی ہی ویرانی تھی۔ مذکورہ لوگوں کے چہرے بھی نہایت سوگوار اور آدم ہزار سے لگتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں زبردستی کسی جرم کی سزا دے کر یہاں بٹھا دیا گیا ہو۔

الفصل کو اگر تبلیغی سرکلر کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ضیا الاسلام پریس سے

جاری ہونے والے اس اخبار میں مرزا قلیانی کے پرانے خطبے اور ”نور کاہل اور ہانموں“ کے اشتہاروں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی خریداری تمام مرزائی امت کا فرض لازم تھی۔ اخبار کے دفتر کے باہر اگر جہازی ساز کا بورڈ آویزاں نہ ہوتا تو اس کے اخبار کے دفتر ہونے کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اخبار میں مرزائی قارئین کو ہتانے کے لئے بیرون ملک مرزائی مبلغین کی سرگرمیاں تحریر کی جاتیں کہ ”انہوں نے فلاں فلاں ملک میں کتنے لوگوں کو داخل کفر کر لیا ہے“ اس طرز عمل سے مرزائیوں کو یہ ہٹانا بھی مقصود ہوتا تھا کہ مرزائی مذہب دنیا میں زیادہ سے زیادہ فروغ پا رہا ہے۔ اندرون و بیرون ملک مرزائی امت پر اخبار کی خریداری اس لئے بھی لازم تھی کہ اس سے اخبار کی آمدن میں اضافہ ہو سکے۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نام نہاد اخبار کے درپردہ مرزائیوں کا کوئی خفیہ مشن بھی تھا کیونکہ مرزائیوں کی یادہ گوئی پر مبنی مذہبی کتب اعلیٰ پریس پر اخبار کی آڑ میں چھپا کرتی تھیں۔ اخبار کا پریس بھی کسی نامعلوم جگہ پر نصب کیا گیا تھا۔

جونک نہیں لگتی پتھروں کو

ربوہ آتے ہی بھیرہ کے مختلف ربوہ نشینوں نے ہماری دعوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بھیرہ کے جن لوگوں نے ہمیں ربوہ میں مقیم اپنے رشتہ داروں کے حوالے اور پتے دیے تھے، انہوں نے بھرپور انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہر دوسرے تیسرے روز ایک دعوت ہونے لگی۔ جن خاندانوں نے ہمیں بھرپور پروٹوکول دیا، ان میں میاں عطا الرحمن فیملی قابل ذکر ہے۔ بھیرہ نژاد یہ خاندان ”خاندان طبیعات“ کہلاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گھر کے فرد اول میاں عطا الرحمن ربوہ کے ڈگری کالج میں فزکس کے پروفیسر تھے اور ایم۔ ایس سی طبیعات کی کلاسیں لیتے تھے۔ جب کہ ان کے بیٹے لطف الرحمن، لطف المنان، حبیب الرحمن اور شفیق الرحمن سب کے سب فزکس میں ماسٹر ڈگری یافتہ تھے۔ لطف الرحمن تو ہمارے سکول میں سائنس ٹیچر بھی رہے تھے۔ بعد ازاں وہ بیرون ملک چلے گئے جبکہ لطف المنان تعلیم السلام کالج ربوہ میں فزکس پڑھاتے تھے۔ میاں عطاء الرحمن کی تین بیٹیاں امتہ الطیف، امتہ الرفق اور امتہ السمع تھیں۔ اول الذکر دونوں نصرت گر لڑہائی سکول میں پڑھاتی تھیں جبکہ امتہ السمع میری کلاس فیلو تھی۔

اس خاندان کی ہمارے ساتھ وارفٹل کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نہ صرف ہماری دعوت کی بلکہ مجھے اور میری ایف۔ اے کی طالبہ بہن کو پڑھانے کی پیشکش بھی کر دی۔ ہمیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ چنانچہ میری بہن میاں عطاء الرحمن کی بڑی بیٹی امتہ الطیف اور میں امتہ الرفق کے پاس پڑھنے لگا۔ ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ہر روز شام وہ پڑھنے کے دوران ہمیں ٹھنڈا دودھ بھی پلاتے اور جس روز ہم پڑھنے نہ جاتے، ان کے گھر سے فوراً ”کوئی نہ کوئی ہمارے نہ آنے کی وجہ پوچھنے ہمارے گھر آ جاتا۔ یہ سلسلہ چھ سات مہینے چلتا رہا۔ اس دوران امتہ الطیف میری بہن کو کپڑے بھی

سی کر دیا کرتی تھیں۔ ان لوگوں کی طرف سے براہ راست تو ہمیں مرزائیت قبول کرنے کی کبھی کوئی پیشکش نہیں ہوئی۔ تاہم میاں عطاء الرحمن کی اہلیہ فضل الہی بیگم ہم دونوں بہن بھائیوں کو یہ ضرور بتاتی رہتی تھیں کہ میں جب گھر کا کام کرتی ہوں تو ساتھ ساتھ ”در ثمین“ کے اشعار پڑھتی رہتی ہوں۔ جب ہم پوچھتے کہ ”در ثمین“ کیا چیز ہے تو کہتی ”یہ ہمارے مرزا غلام احمد کا کلام ہے“ پھر وہ اپنے مذہب اور حضرت صاحب کی تعریفیں کرنے لگتی۔ جبکہ اس کی بیٹیاں امتہ الطیف اور امتہ الرفیق اسے ٹوکتے ہوئے کہتیں ”امی جان! چھوڑیں یہ قصے، بچوں کو پڑھنے دیں۔“ امتہ السمع میرے ساتھ ہر روز ایک بات کرتی ”تم نے حضرت مسیح موعود دیکھے ہیں“ میں جواب دیتا ”نہیں“ پھر وہ کہتی ”اچھا میں تمہیں دکھاؤں گی۔“ بات آئی گئی ہو جاتی۔ ایک روز اس نے پھر کہا تو میں نے جواب دیا ”تم روز کہتی ہو، کسی روز دکھا ہی دو۔“

میرا جواب سن کر وہ بہت خوش ہوئی اور کمرے سے ایک تصویر اٹھا لائی میں نے تصویر دیکھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ”مرزا غلام احمد“ کی شکل دیکھی تھی۔ مجھے اس کی شکل اس قدر بری لگی کہ میں کوشش کے باوجود اپنے تاثرات کو زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔ اور برملا کہہ ڈالا ”یہ نبی ہے نبی اس قدر مکروہ صورت نہیں ہو سکتے۔“ میرے جواب پر امتہ السمع کے چہرے کا رنگ ہی اتر گیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ان لوگوں کی چاہت ماند پڑنے لگی۔ ہم معمول کے مطابق پڑھنے جاتے تو وہ لوگ ایک تو تدریس میں عدم دلچسپی سے کام لیتے دوسرے کبھی طبیعت کی خرابی کا عذر تراش کر پڑھانے سے اجتناب کرتے۔ کبھی مہمانوں کا بہانہ کر کے ہمیں ٹال دیا جاتا۔

مرزا غلام احمد کی تصویر دیکھنے والا واقعہ سننے کے فوراً بعد میرے ابا جی نے ہمیں آگاہ کر دیا تھا کہ یہ لوگ اب تمہیں زیادہ دیر نہیں پڑھائیں گے۔ بہر حال ہم نے ایک آدھ دن یہ روش دیکھی تو پھر ان کے گھر آنا جانا چھوڑ دیا۔ ان لوگوں نے بعد میں تعلق کو اس قدر موقوف کر دیا کہ آتے جاتے کہیں ملتے تو سلام دعا سے بھی گریز کرتے۔ بعد ازاں بھیڑ سے معلوم ہوا کہ میاں عطاء الرحمن فیملی ہمارے بارے میں

نہایت پر امید تھی کہ ہم بہت جلد مرزائیت اختیار کر لیں گے لیکن ان کے انتہائی حسن سلوک کے بلوجود ہم بہت ڈھیٹ نکلے۔ چنانچہ انہیں خود ہی کنارہ کشی کرنا پڑی۔ ہمیں سن کر حیرت کی بجائے مسرت ہوئی۔ ابا جی نے کہا وہ حسن سلوک کے ہزاروں پارہ بھی بیل لیتے، تو بھی بھلا پتھر کو کبھی ”جو تک“ لگ سکتی ہے۔

ہم لوگ مرزائیوں سے بحث مباحثے یا مذاکرے کے لئے بہت زیادہ علمیت تو نہیں رکھتے تھے لیکن ایک دین دار گھرانے کے افراد ہونے کے باعث اللہ کے فضل و کرم سے جب بھی کسی مرزائی کے ساتھ ”بحث کا میچ“ پڑا انہیں ٹھیک ٹھیک جواب دے کر ہمیشہ پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اور تو اور میری امی جان جو پڑھی لکھی خاتون نہیں لیکن ”گڑھی“ ضرور ہیں، وہ بھی مرزائیوں کو ”وارے“ میں نہیں آنے دیتیں تھیں۔ بھیرہ کے ساتھ ایک قصبہ ”نمک میانی“ ہے۔ یہ ہمارا ننھیالی قصبہ ہے۔ یہاں کا ایک مرزائی ”جلنہ“ خاندان بھی ربوہ میں آبلو تھا۔ اس خاندان کی ایک خاتون صالحہ بیگم محلہ دارالرحمت کی خواتین کی صدر محلہ اور ہماری گلی کی نگر پر رہتی تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ بھیرہ میانی کی ایک فیملی جو مرزائی نہیں ہے، ربوہ آچکی ہے۔ چنانچہ وہ ہمارے خاندان پر طبع آزمائی کرنے ایک روز ہمارے گھر آئی۔ تعارف اور حسب توفیق خاطر مدارات کے بعد موصوفہ اصل مقصد پر آنے کے لئے پر تو لنے لگیں۔ یہ بات ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ ہم نے زندگی کے کسی موڑ اور مقام پر اپنی بولی نہیں بدلی۔ الحمد للہ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ نہایت روانی سے بولتے ہیں لیکن بھیرہ کی بولی سے پیار کا یہ عالم ہے کہیں راستے یا سفر میں کوئی شخص بھیرہ کی بولی بولتا ہوا ملے تو کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ ہماری امی جان کو بھیرہ کی ٹھیٹ پنجابی بولتے ہوئے صالحہ بیگم نے بت کا آغاز کیا اور کہا ”بس جی! تسی اپنی بولی نہیں بدلی“ امی جان نے جواب دیا ”ہم لوگ بولی بدلتے ہیں نہ مذہب“ امی جان کو ”مذہب“ کی جگہ دراصل ”ذات“ کہنا چاہئے تھا مگر انہوں نے دانستہ ”مذہب“ کا لفظ استعمال کیا۔ درحقیقت وہ اپنی زیر کی بنا پر بھانپ چکی تھیں کہ موصوفہ تبلیغ کرنے آئی ہے۔

صالح بیگم نے امی جان کی بات سنی تو اسے اپنا مقصد پورا ہوتا مشکل نظر آیا۔ چنانچہ اس نے کچھ دیر کے لئے موضوع چھیڑنے سے گریز کیا مگر پھر جب اس سے نہ رہا گیا تو کہنے لگی ”بہن جی! ہمارے محلے میں جمعات کو خواتین کا ایک اجلاس ہوتا ہے آپ وہاں آیا کریں۔ اس سے ایک تو واقفیت بڑھتی ہے، دوسرے وہاں اچھی اچھی دین کی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ ضرور آیا کریں۔“ امی جان نے کہا ”دیکھیں بہن! جہاں تک واقفیت بڑھانے کا تعلق ہے، اس کا اول تو مجھے شوق ہی نہیں۔ دوسرے میں مصروف خاتون خانہ ہوں۔ گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ کہیں جایا جائے۔ رہ گئی بات دین کی باتوں کی تو آپ کے اور ہمارے دین میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہم اپنے دین کے بارے میں الحمد للہ بہت کچھ جانتے ہیں۔“ صالح بیگم لا جواب تو ہو چکی تھی، لیکن مرزائیوں کی روایتی خوبی کے پیش نظر ڈوٹی رہی۔ مرزائیوں کا خاصا ہے کہ وہ بحث اور تبلیغ کرتے وقت گالیاں اور جوتیاں بھی کھاتے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح تبلیغ جاری رکھتے ہیں۔ یہ شاید انہیں اپنے ”نبی“ کی طرف سے ہدایت ہے۔ صالح بیگم نے بھی ہمت نہ ہاری اور پھر کہنے لگی ”آپ ایک مرتبہ ہمارے اجلاس میں آئیں تو سہی۔“ امی جان نے بھی حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا ”نی بھینا! جس گراں نہیں جانا“ اس دا نل پچھ کے، کے لینا“ یہ شافی جواب سن کر صالح بیگم کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ اور وہ بے نیل و مرام واپس چلی گئی۔ اسی شام صالح بیگم کا دیور چودھری نذیر جسے لوگ چودھری ”ننڈی صاحب“ کہا کرتے تھے، ہمارے ہاں آیا اور ابا جی سے کہنے لگا ”میری بھابھی آپ کے ہاں تبلیغ کرنے آئی تھی مگر آپ کی بیوی کے منہ توڑ جواب نے اس کا خوب مان توڑا۔ وہ تو گھر سے بڑے دعوے کر کے چلی تھی۔ چودھری نذیر نے ابا جی کو بتایا کہ میں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود گھر پر فارغ پڑا ہوں۔ ان کو میری بھلائی اور نوکری کا کبھی کبھی خیال نہیں آتا اور دوسروں کو مرزائی بنانے چل پڑتے ہیں۔ اس شخص نے اپنے ”نبی“ اور اس کی امت کو خوب گالیاں دیں اور کہنے لگا کہ میں تو مجبور ہوں۔ کوئی حیلہ وسیلہ نہیں ورنہ اس جھوٹے مذہب پر لعنت بھیج کر اسے کب کا چھوڑ

چکا ہوتا۔

ہمارے پڑوس میں سیکرٹری ٹاؤن کمیٹی نور احمد عابد رہا کرتے تھے۔ ان کی اہلیہ رشیدہ بیگم نہایت متعصب خاتون تھیں۔ وہ مرزائیت کی آفاقی حیثیت اور جھوٹے خاندان نبوت کی حیثیت اجاگر کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا کرتی تھیں۔ مرزا ناصر کی ہمارے گھر آمد کے بعد وہ ہماری امی جان سے کہنے لگی ”آپاجی! اب تو آپ لوگوں کو ضرور کچھ سوچنا چاہئے جس طرح ہمارے حضرت صاحب نے آپ کے گھر آکر کرم فرمایا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ آپ لوگ اب احمدی ہو جائیں۔ میری مائیں اور آج ہی بسم اللہ کریں۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔“ امی جان ہنڈیا پکا رہی تھیں۔ اس کی بات بھی سن رہی تھیں۔ ہنڈیا میں اطمینان سے چچہ ہلاتے ہوئے امی جان نے نہایت نرمی سے کہا ”آپاجی اللہ کے فضل سے ہم پہلے ہی احمدی ہیں اور اپنے نبی احمد ﷺ کی امت ہیں۔ تاہم مرزائی نہیں ہیں اور اللہ ہمیں معاف کرے اور مرزائیت سے اپنی حفظ و امن میں رکھے۔ رہی بات مرزا ناصر کی آمد کی تو وہ صوفی صاحب اور ان کی دوستی کا معاملہ ہے۔ ہم نے انہیں بلایا نہیں تھا۔ اسی طرح کے ہمارے دوستانہ تعلق تو قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بھی رہے ہیں۔ کئی بڑے بوڑھے ہندو سکھ ہم جیسے مسلمانوں کے ہاں آتے جاتے تھے۔ تو کیا ہم ان کی آمد پر ہندو سکھ ہو جاتے۔ یہ بات سن کر موصوفہ کچھ بولے بغیر چلی گئی۔

مرزائیوں کے پاس مسلمانوں کو مرزائی بنانے کا سب سے ناور کلیہ زن، زر اور زمین ہے۔ وہ مجبور لوگوں پر عنایات کی بارش کر کے انہیں دام میں پھنسا لیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ وہ تو حضرت محمد ﷺ کے ہی ماننے والے ہیں اور آپ ﷺ پر سچا ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے لئے ربوہ شہر کے اکثر در و دیوار پر ایسے شعر رقم کیے گئے تھے جنہیں پڑھ کر باہر سے آنے والے مسلمان ایک بار یقین کر لیتے کہ مرزائیوں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی کئی بڑے بوڑھے لگے ہوئے تھے جن پر حسب ذیل

عبارات و اشعار تحریر تھے۔

”اللہ تعالیٰ کہنے میں بڑی برکات ہیں“

”پاک محمد مصطفیٰ سب نبیوں کا سردار“

وہ پیشوا ہمارا جس سے ہے نور سارا
نام اس کا ہے محمد دلبر میرا یہی ہے
جمال و حسن قرآن نور جان ہر مسلمان ہے
قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآن ہے
ہو فضل یا رب تیرا یا کوئی ابتلا ہو
راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تیری رضا ہو

ایسی عبارات اور اشعار پڑھ کر اچھا بھلا مسلمان جھانسنے میں آ جاتا ہے۔ ربوہ کے علاوہ قادیان میں بھی ایسے کلمات دیواروں اور بورڈز پر تحریر تھے۔ چار سہہ کا ایک پٹھان ہدایت اللہ خان ہمارے ابا جی کا دوست بن گیا۔ اس کو احمدیوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ اکثر ہمارے گھر آتا اور ابا جی سے کہتا ”صوفی صاحب! مہربانی کر کے ہمارے لئے دعا کرو تاکہ ہم اس جنم سے کسی طرح نکل جائیں“۔ ابا جی نے اس سے پوچھا ”خان صاحب! آپ مرزائی ہوئے کیسے؟“ کہنے لگا ”بھائی کیا بتاؤں میری قسمت خراب تھی۔ ایک بار اپنے ایک دوست سے ملنے گور داس پور گیا۔ وہاں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو احمدی تھا۔ اس نے مجھے نہ جانے کیسے شیشے میں اتارا کہ میں قادیان چلا گیا۔ شہر میں ہر جگہ ہمارے کالی کملی والے نبی مٹھیہ کی شان میں اشعار پڑھنے کو ملے۔ میں نے سوچا کہ یہ مرزائی تو اپنے جیسے مسلمان ہیں۔ لہذا ان کا دین قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں ان دنوں بھرپور اور خوبصورت نوجوان تھا۔ مذکورہ شخص مجھے اپنے ایک عزیز کے گھر لے گیا جس کی بیٹی بہت خوبصورت تھی۔ اسے میں نے دیکھا تو پھر کوئی ہوش ہی نہ رہا۔ اس سے شادی کے لئے میں نے بغیر کسی حیل و حجت کے احمدیت قبول کر

لی۔ ان لوگوں نے وہیں میری شادی کر دی۔ میرے والدین مرزائیت کے سخت خلاف تھے لہذا میں واپس گھر نہیں جاسکتا تھا۔ چنانچہ قادیان کا ہی ہو کر رہ گیا۔ بعد ازاں تقسیم کے بعد ربوہ آگیا۔ ان میں رہ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ مذہب نہ صرف جھوٹا ہے بلکہ اس کے بانیوں اور ماننے والوں میں مکاری اور چالبازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اب تو میری بیوی بھی میری ہم خیال ہو چکی ہے۔ اور ہم دونوں احمدیت سے تائب ہونا چاہتے ہیں۔

ابا جی، خان صاحب کو سلار والا کے صوفی برکت صاحب کے پاس لے گئے جہاں خان صاحب نے اسلام قبول کیا اور کچھ عرصہ بعد ربوہ کو چھوڑ کر چار سدہ واپس چلے گئے۔

ابا جی کو محکمہ کی طرف سے دو ”بیلدار“ ملے ہوئے تھے۔ ان کی رہائش گاہ بھی ہمارے گھر کے قریب تھی۔ ان میں سے ایک کا نام طالب حسین تھا جبکہ دوسرا متیلا تھا۔ طالب حسین اچھی شکل و صورت کا چالاک آدمی تھا۔ ان لوگوں کے پڑوس میں ایک شخص ظفر رہتا تھا۔ جس کی بیوی کا نام زبیدہ تھا۔ دونوں میاں بیوی نے طالب حسین کو مرزائیت میں داخل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ زبیدہ تو طالب حسین پر باقاعدہ ”لٹو“ بھی ہو گئی۔ ابا جی کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے طالب حسین کو بلا کر سمجھایا۔ پہلے تو اس نے ٹالا ”ایسی کوئی بات ہی نہیں“ مگر جب ابا جی کی طرف سے سرزنش ہونے کے ساتھ یہ دھمکی بھی ملی کہ اس کا تبادلہ کرا دیا جائے گا تو کہنے لگا ”یہ بات درست ہے کہ مذکورہ شخص ظفر اور اس کی بیوی نے اسے مرزائیت کے بہت قریب کر دیا ہے۔“ ابا جی طالب حسین کو لے کر فوراً ”دریائے چناب پر واقع وادی عزیز کے سجادہ نشین صوفی محمد علی صاحب“ کے پاس لے گئے اور ان سے بیعت کرا دیا۔ جب ظفر اور اس کی بیوی زبیدہ کو یہ خبر ہوئی کہ طالب حسین مرزا ناصر احمد کی بیعت کرنے کی بجائے کسی مسلمان پیر کا مرید بن گیا ہے تو انہوں نے طالب پر اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے۔

ربوہ کی نواحی بستی چمن عباس میں ایک نذیر چنگڑ کی کرپانے کی دکان تھی۔ ربوہ کے مرزائی دکان دار ہر چیز مہنگی بیچا کرتے تھے۔ چنانچہ ربوہ والوں کی اکثریت نذیر چنگڑ کی دکان سے سودا سلف خریداکرتی تھی۔ ان لوگوں نے سستا سودا خریدنے کا اجر نذیر چنگڑ کو یہ دیا کہ اسے مرزائی کرنے کا منصوبہ شروع کردیا۔ ہم لوگ بھی اس کی دکان سے ہی سودا سلف خریداکرتے تھے۔ نذیر نے اباجی کو بتایا کہ ربوہ والے اسے مرزائیت کی دعوت دے رہے ہیں۔ اباجی نے اسے فوراً روکا اور کہا ”خبردار کافر ہو جاؤ گے۔ مرزا قادیانی تو مرتد اور دجال ہے۔ ان کافروں کے جال سے بچنا“۔ اس پر نذیر نے کہا ”صوفی صاحب! آپ مجھے کوئی راہ دکھائیں ورنہ یہ لوگ جس طرح میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، مجھے گمراہ کر کے چھوڑیں گے۔ اباجی کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اسے بھی وادی عزیز لے گئے اور صوفی محمد علی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرا دیا۔ بعد میں مرزائیوں نے حسب معمول نذیر کو جب دعوت تبلیغ دی تو اس نے کہا ”تم مجھے روز تبلیغ کرتے ہو آج میری بات بھی سنو“۔ مرزائی سمجھے شاید پیچھی وام میں آنے والا ہے۔ لہذا انہوں نے کہا ”کہو کیا کہتے ہو؟“ اس پر نذیر نے انہیں کہا ”مجھے مرزائی بنانے کے بجائے میری مانو اور مرزا غلام احمد کے جھوٹے مذہب سے تائب ہو جاؤ۔ چلو میں تمہیں اپنے پیر کے پاس وادی عزیز شریف لے چلوں“۔ یہ سننا تھا کہ مرزائیوں کے رنگ فق ہو گئے اور پھر انہوں نے نذیر کو مرزائیت کی دعوت دینے کی کوشش نہیں کی۔

محکمہ ٹیلی فون کا ایک ملازم فضل احمد ربوہ میں رہتا تھا۔ راولپنڈی کے اس شخص کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ اس کے بیٹے منور کو مرزائیت سے سخت نفرت تھی۔ چنانچہ وہ باپ سے ناراض ہو کر اپنی مسلمان پھوپھی کے ہاں پنڈی میں مقیم ہو گیا۔ فضل احمد نے بیٹے کو گھر واپس لانے اور مرزائیت میں داخل کرنے کے لئے سرتوڑ کوششیں کیں مگر ناکام رہا۔ فضل احمد نے اس سلسلے میں ایک مرزائی مبلغ جمیل الرحمن رفیق سے مدد طلب کی۔ موصوف فضل احمد کے گھر آیا اور یقین دہانی کرائی کہ وہ اس

کے بیٹے کو دوبارہ مرزائی کر لے گا۔ لیکن بجائے اس کے کہ جمیل الرحمن رفیق منور کو مرزائی کرتا، وہ خود فضل احمد کی بیٹی ناصرہ پر لٹو ہو گیا۔ خوبصورت ناصرہ جمیل الرحمن رفیق کو اپنا انکل سمجھ کر اس کی خوب خاطر مدارات کرتی رہی مگر انکل کچھ اور ہی نکلا اور چند روز بعد ہی اس نے فضل کو شادی کے لئے پیغام بھجوا دیا۔ مرزائی مرکز کی طرف سے بھی جمیل الرحمن رفیق کی سفارش ہوئی لہذا بیچارہ فضل احمد انکار نہ کر سکا۔ چنانچہ اسے اپنی لڑکی کی شادی دگنی عمر کے شخص سے کرنی پڑ گئی۔ جمیل الرحمن رفیق ناصرہ کو لے کر چلتا بنا جو اب اس کی کئی بیٹیوں کی ماں ہے۔ یوں فضل احمد بیٹے کو مرزائی بنانے کے چکر میں بیٹی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

مرزائیوں نے ارتداد کے عجیب و غریب طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ یہ لوگ دیہات کے غریب لڑکوں کو تعلیم دلوانے کا جھانسنے لگے کر شیشے میں اتار لیتے تھے اور بعد میں بار احسان تلے دبے ہوئے یہ لڑکے مرزائی ہو جاتے۔ ان مرزائی لڑکوں کو مسلمان خاندانوں کے سامنے غیر مرزائی ظاہر کر کے ان کی شادی مسلمان لڑکیوں سے کر دی جاتی تھی۔ ایک مولوی کا تو یہ باقاعدہ کاروبار تھا۔ وہ جماعت سے فنڈز لیتا۔ دیہاتی غریب لڑکوں کو تعلیم و ملازمت دلواتا پھر ان کے رشتے مسلمان گھرانوں میں کر دیتا۔ اس شخص نے ایک نہایت شریف اور خدا رسیدہ شخص کے ساتھ ایسا ہی دھوکہ کیا اور اپنے ایک پروردہ ”جنگلی“ لڑکے کو ایک مسلمان کی تعلیم یافتہ بیٹی کے ساتھ بیاہ دیا۔ دو بچوں کے بعد مذکورہ مسلمان خاندان پر حقیقت کھلی تو وہ سرپیٹ کر رہ گئے مگر اب تو چڑیاں کھیت چک چکی تھیں۔

اسی طرح مرزائی لڑکوں کی ڈیوٹی تھی کہ وہ مسلمانوں کی لڑکیوں کو شیشے میں اتاریں اور پھر انہیں اپنی زوجیت میں لائیں۔ یہاں ایک واقعہ جو لطیفہ بن گیا، قابل ذکر ہے۔ ایک مرزائی عبدالواسع نے ”مری“ میں سیر کے دوران ایک لڑکی کے ساتھ مراسم استوار کر لئے۔ وہ بہت خوش تھا کہ ایک مسلمان لڑکی پھنس گئی۔ جس کے عوض اسے مرکز سے بھاری معاوضہ ملے گا۔ مگر بعد میں اس پر انکشاف ہوا کہ وہ لڑکی چنیوٹ کے

سرور عبدالقادر قادیانی کی بیٹی نجی ہے جو مسلمان نہیں مرزائی ہے بلکہ وہ بھی جماعت کی طرف سے مسلمان مرد مرزائی بنانے پر مامور ہے۔ اور اس نے مذکورہ شخص کو مسلمان لڑکا سمجھ کر لفٹ کرائی تھی۔ مرزائیوں کے مسلمان عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا گھناؤنا منصوبہ اس قدر عام رہا ہے کہ ایک مرزائی اسلم چودھری نے ایک مسلمان عورت زریںہ عرف بلو سے دوستی کر لی جس کا خلوند تلاش معاش کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ بعد ازاں اس عورت سے مرزائی امت کے اس سپوت نے جس کو خدا کے ساتھ ہم کلام ہونے کا دعویٰ ہے، ایک ناجائز بیٹا پیدا کیا جو اب جوان ہو چکا ہے۔ اس کا نام ارسلان ہے۔

احمدی تو ہم ہیں

ربوہ آئے ہوئے ہمیں کچھ روز گزرے تھے کہ مجھے تعلیم الاسلام ہائی سکول میں چھٹی جماعت کے سیکشن ”سی“ میں داخل کرا دیا گیا۔ سکول بہت بڑا تھا اس کے بلوجود طلبہ کی زیادہ تعداد کے باعث ہماری کلاسیں بورڈنگ ہاؤس میں لگا کرتی تھیں۔ ہمارے کلاس انچارج ماسٹر بشارت احمد تھے۔ وہ اگرچہ مرزائی تھے تاہم نہایت خلیق انسان تھے۔ انہیں دیکھ کر میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ کاش یہ شخص مرزائی نہ ہوتا۔ کئی بار میرا دل چاہتا کہ ماسٹر بشارت مرزائیت سے تائب ہو جائیں۔ ہمارے پیریڈ نو ہوتے جو مختلف استاد پڑھایا کرتے تھے۔ اساتذہ کی اکثریت مرزائی تھی جن میں تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

کلاس میں جاتے ہی سب سے پہلے مجھے جس چیز کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ ہر لڑکا مجھ سے ایک ہی سوال کرتا ”آپ غیر احمدی ہیں“ مجھے یہ بات تو بخوبی معلوم تھی کہ غیر احمدی کا مطلب یہی ہے کہ میں مرزائی نہیں ہوں لیکن حیرت یہ تھی کہ ہر شخص آخر مجھ سے ہی کیوں یہ سوال کیوں کر رہا ہے۔ آخر کلاس میں اور بھی تو مسلمان لڑکے ہوں گے۔ میرے ماتھے پر تو یہ نہیں لکھا ہوا کہ میں مرزائی نہیں ہوں۔ گھر آ کر میں نے یہ بات اباجی کو بتائی تو انہوں نے کہا ”تمہارے گلے میں پڑا ہوا تعویذ اس بات کا ٹائٹل ہے کہ تم مرزائی نہیں ہو“۔ ان کی بات واقعی درست نکلی۔ چند روز بعد جب لڑکے مجھ سے بے تکلف ہوئے تو انہوں نے تعویذ کے بارے میں مجھ سے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ میں نے انہیں کئی شافی جواب دیئے لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ جو چیز نہایت دلچسپی کی حامل تھی، جس سے میں آج بھی لطف اندوز ہوتا ہوں، وہ ہے ہماری بھیرہ کی سرائیکی طرز کی بولی، جس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ خاص طور پر میرا ”پھر کیا ہوا“ کو ”وت کے ہویا“ کہنا لڑکوں کو عجیب اور نہایت بھلا معلوم ہوا۔

میرا یہ ”تکلیہ کلام“ اس قدر مشہور ہوا کہ اساتذہ اور ساتھی طلبہ جب بھی مجھے ملتے کوئی اور بات کئے بغیر بے ساختہ کہتے ”وت کے ہویا“ حالانکہ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کے بارے میں مزید کچھ دریافت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلے پہلے مجھے اس طرز عمل سے خفت سی ہوتی لیکن بعد میں، میں نے بھی انجوائے کرنا شروع کر دیا۔ میں نے ربوہ میں لوگوں کو ٹوپی پہنے دیکھ کر جس ناگواری کا اظہار کیا، اس کا خمیازہ مجھے یوں بھگتنا پڑا کہ میرے سکول یونیفارم میں خاکی پینٹ، سفید قمیص کے ساتھ کالی ٹوپی بھی شامل تھی۔ یوں مجھے بھی سیاہ رام پوری کیپ پہننا پڑی۔ سکول میں ٹوپی نہ پہننے پر سخت سزا ملا کرتی تھی۔ ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر میاں محمد ابراہیم تھے۔ ان سے ملاقات بغیر ٹوپی کے نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے ٹوپی سے سخت نفرت تھی میں اکثر ٹوپی بستے میں رکھ دیتا۔ جو خفیہ ضرورت محسوس ہوتی، پن لیتا۔ ایکبار ہیڈ ماسٹر ابراہیم میرے پاس سے گزرے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے جواب کے بجائے کہا:

”سر سے بھی ننگے پاؤں سے بھی ننگے“

میں بہت حیران ہوا کیونکہ میرے سر پر اگرچہ ٹوپی نہیں تھی تاہم میرے پاؤں میں ہوائی چپل تو تھی۔ میرے استفسار پر ایک ہم جماعت نے بتایا کہ ”تم نے ہوائی چپل پہنی ہوئی تھی جو کہ پاؤں ڈھانپنے کے لئے ناکافی ہوتی ہے لہذا ہیڈ ماسٹر صاحب نے تمہیں پاؤں سے ننگا کہا ہے۔“

سکول میں ٹیکسٹ بک بورڈ کے نصاب کی دینیات کو بالکل برائے نام حیثیت حاصل تھی جبکہ اس کی جگہ جبری طور پر مرزا قادیانی کی کتاب ”کشتی نوح“ پڑھائی جاتی تھی۔ ہمارے دینیات کے استاد احمد علی تھے۔ نو ماہی امتحان میں دینیات کا سارا پرچہ کشتی نوح سے آیا جب کہ دینیات کا ۲۰ نمبر کا ایک سوال اصل کورس میں سے شامل کیا گیا۔ میں نے صرف ۲۰ نمبر کا ایک سوال کر کے باقی ”کشتی نوح“ والا حصہ چھوڑ دیا۔ نتیجہ ”مجھے سو میں سے ۱۳ نمبر دے کر فیل کر دیا گیا جس پر میرے ابا جی نے بڑا سٹینڈ لیا۔ مرزا ناصر احمد سے بات کی گئی جس پر مرزائی مرکز حرکت میں آ گیا۔ آئندہ کے لئے مسلمان

میرا یہ ”نگیہ کلام“ اس قدر مشہور ہوا کہ اساتذہ اور ساتھی طلبہ جب بھی مجھے ملتے کوئی اور بات کئے بغیر بے ساختہ کہتے ”وت کے ہویا“ حالانکہ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کے بارے میں مزید کچھ دریافت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلے پہلے مجھے اس طرز عمل سے خفت سی ہوتی لیکن بعد میں، میں نے بھی انجوائے کرنا شروع کر دیا۔ میں نے ربوہ میں لوگوں کو ٹوپی پہنے دیکھ کر جس ناگواری کا اظہار کیا، اس کا خمیازہ مجھے یوں بھگتنا پڑا کہ میرے سکول یونیفارم میں خاکی پینٹ، سفید قمیص کے ساتھ کالی ٹوپی بھی شامل تھی۔ یوں مجھے بھی سیاہ رام پوری کیپ پہننا پڑی۔ سکول میں ٹوپی نہ پہننے پر سخت سزا ملا کرتی تھی۔ ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر میاں محمد ابراہیم تھے۔ ان سے ملاقات بغیر ٹوپی کے نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے ٹوپی سے سخت نفرت تھی میں اکثر ٹوپی بستے میں رکھ دیتا۔ جو نہی ضرورت محسوس ہوتی، پہن لیتا۔ ایک بار ہیڈ ماسٹر ابراہیم میرے پاس سے گزرے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے جواب کے بجائے کہا:

”سر سے بھی ننگے پاؤں سے بھی ننگے“

میں بہت حیران ہوا کیونکہ میرے سر پر اگرچہ ٹوپی نہیں تھی تاہم میرے پاؤں میں ہوائی چپل تو تھی۔ میرے استفسار پر ایک ہم جماعت نے بتایا کہ ”تم نے ہوائی چپل پہنی ہوئی تھی جو کہ پاؤں ڈھانپنے کے لئے ناکافی ہوتی ہے لہذا ہیڈ ماسٹر صاحب نے تمہیں پاؤں سے ننگا کہا ہے۔“

سکول میں ٹیکسٹ بک بورڈ کے نصاب کی دینیات کو بالکل برائے نام حیثیت حاصل تھی جبکہ اس کی جگہ جبری طور پر مرزا قادیانی کی کتاب ”کشتی نوح“ پڑھائی جاتی تھی۔ ہمارے دینیات کے استاد احمد علی تھے۔ نو ماہی امتحان میں دینیات کا سارا پرچہ کشتی نوح سے آیا جب کہ دینیات کا ۲۰ نمبر کا ایک سوال اصل کورس میں سے شامل کیا گیا۔ میں نے صرف ۲۰ نمبر کا ایک سوال کر کے باقی ”کشتی نوح“ والا حصہ چھوڑ دیا۔ نتیجہ ”مجھے سو میں سے ۱۳ نمبر دے کر فیل کر دیا گیا جس پر میرے ابا جی نے بڑا شینڈ لیا۔ مرزا ناصر احمد سے بات کی گئی جس پر مرزائی مرکز حرکت میں آ گیا۔ آئندہ کے لئے مسلمان

طلبہ کو ”کشتی نوح“ سے تو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا لیکن سکول میں قیام کی تمام مدت مجھے ماسٹر احمد علی کے عتاب اور تعصب کا نشانہ بننا پڑا۔ موصوف مجھے ہمیشہ ”غیر احمدی“ لڑکا کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

ہماری کلاس میں مرزا رفیع کا بیٹا طیب، مرزا ناصر کا بیٹا لقمان، مرزا انور کا بیٹا احسن اور میر داؤد کا بیٹا قمر سلیمان بھی پڑھتے تھے۔ لقمان تو باپ کے خلیفہ بنتے ہی سکول چھوڑ گیا بلکہ اسے پڑھانے سکول خود چل کر قصر خلافت جاتا تھا۔ یعنی اساتذہ اسے پڑھانے کے لئے جاتے تھے۔ احسن اور قمر سلیمان نسبتاً اچھے لڑکے تھے جبکہ طیب انتہائی متعصب لڑکا تھا۔ اسے میرے ساتھ نہ جانے کیوں خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ میرا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ بلکہ ماسٹر احمد علی کی طرح ہمیشہ مجھے ”غیر احمدی لڑکا“ کہا کرتا تھا۔ ایک روز اس کے ساتھ میری اس بات پر سخت لڑائی ہو گئی۔ میں نے کہا ”تم مجھے غیر احمدی کہتے ہو حالانکہ تم خود غیر احمدی بلکہ مرزائی ہو۔“

میں نے گھر آکر اپنے ابا جی سے کہا کہ ”کل سے میں نے مرزائیوں کے سکول نہیں جانا۔“ انہوں نے مسئلہ دریافت کیا اور میرے بتانے پر وہ مجھے لے کر مرزا رفیع کے گھر گئے۔ ہم محلہ دارالصدر میں واقع قصر خلافت میں مرزا رفیع کے گھر پہنچے۔ وہ خود گھر موجود نہیں تھے۔ مرزا طیب اس وقت ہمارے سکول کے ایک استاد عبدالرحمن اتالیق کے پاس ٹیوشن پڑھ رہا تھا۔ اسے ہماری آمد کا پتہ چلا تو وہ ماسٹر اتالیق کے ہمراہ باہر آ گیا۔ ابا جی نے تو اس کے خوب ”لتے لیے“ اور کہا ”ہم سرکاری ملازم ہیں۔ مرزا قادیانی کی امت نہیں۔ نہ ہی تم لوگوں کی رعایا ہیں کہ ہم پر تمہارے نظریات لاگو ہوں گے۔ اپنے باپ کو بتا دینا کہ ہم لوگ نہ تمہارے ماننے والے ہیں اور نہ تم لوگوں سے متاثر ہیں۔ چنانچہ آئندہ میرے بچے کو ”غیر احمدی“ مت کہنا ”غیر احمدی“ تو تم ہو جب کہ اصل احمدی تو ہم ہیں۔ جو حضرت احمد مظلومؑ کی سچی امت ہیں۔ تم لوگوں نے مرزا قادیانی کی نسبت خود کو احمدی بنا رکھا ہے۔“

ابا جی کا پارہ ذرا نیچے آیا تو ماسٹر اتالیق نے مداخلت کی اور مجھے مخاطب کرتے

ہوئے انتہائی متعصبانہ طریقے سے پوچھا ”لڑکے! تم نے مجھے کبھی سکول میں دیکھا ہے؟“
 کہا ”جناب ہزار بار دیکھا ہے۔“ کہنے لگے ”تو پھر تم اپنے والد صاحب کو تکلیف دینے
 کی بجائے مجھ سے بات کر لیتے“ میں نے کہا ”میں اس بارے میں اپنے کلاس انچارج
 سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں۔ آپ ہمارے انچارج ہیں نہ ہمیں کوئی مضمون پڑھاتے
 ہیں۔ لہذا میں آپ سے کیسے کہہ سکتا تھا؟“۔

ماسٹر اتالیق نے ابا جی کو یقین دلایا کہ ان کا پیغام مرزا رفیع کو پہنچا دیا جائے گا
 اور آئندہ آپ کو کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی۔ اگلے روز میں سکول آیا تو مجھے ہیڈ ماسٹر
 میاں ابراہیم نے طلب کیا اور سارا ماجرا پوچھا۔ میرے بتانے کے بعد انہوں نے نہایت
 شفقت سے کہا ”اول تو آئندہ آپ کے ساتھ کوئی بھی لڑکا ”ایسی“ بات نہیں کرے گا
 اگر ایسا ہو تو آپ سیدھے میرے پاس آئیں گے۔“ اس کے علاوہ میرے اساتذہ کو بھی
 خصوصی ہدایت کی گئی کہ کلاس میں ایسا ماحول پیدا نہ ہونے دیا جائے جس سے صوفی
 فضل کریم صاحب کے صاحبزادے کو کوئی ذہنی اذیت پہنچے۔ اس انقلاب پر میں مسرور
 بھی تھا اور حیران بھی کہ یہ سب اچانک کیسے ہو گیا۔ لیکن جلد ہی پتہ چلا کہ ابا جی کے
 قصر خلافت جا کر ”جھوٹے خاندان نبوت“ کو کھری کھری سنانے سے وہاں ہلچل مچ گئی۔
 مرزائی مرکز کو اطلاع کی گئی۔ مرزا ناصر نے از خود نوٹس لے کر ہدایات جاری کیں۔ یہ
 ابا جی کے ”نعرہ مستانہ اصل احمدی تو ہم ہیں“ کا اعجاز تھا کہ ہر شخص بچھا بچھا جا رہا تھا
 لیکن ماسٹر اتالیق جو بعد ازاں آٹھویں جماعت میں ہمارے کلاس انچارج بنے، ان کا
 تعصب دو چند ہو گیا۔ وہ میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا کرتے تھے۔

اس واقعہ کے بعد کسی کو مجھے ”غیر احمدی“ کہنے کی جرات تو نہ ہوئی تاہم
 میرے کچھ بے تکلف دوست بعض اوقات میرے ساتھ ”سینگ پھسانے“ کی کوشش
 کرتے اور اپنے نبی کی شان بتاتے ہوئے تبلیغ شروع کر دیتے تھے۔ میں کافی دیر ان کی
 باتیں یوں سنتا جیسے واقعی متاثر ہو رہا ہوں لیکن آخر میں جب یہ کہتا کہ ”یار پیغمبر تو
 وقت کا خوبصورت ترین انسان ہوتا ہے تم نے اپنے ”نمونے نبی“ کی شکل پر کبھی غور

کیا ہے" تو ان کے منہ لٹک جاتے اور پھر وہ مرزائیوں کے روایتی حربے پر اتر آتے اور کہتے اس طرح شکل پر اعتراض تو انسانی اقدار کے منافی ہے۔ یوں وہ جذباتی گفتگو کرتے کرتے پھر سے تبلیغ کی طرف آ جاتے۔ ایک روز ایسا ہی سلسلہ جاری تھا میں ان کی خرافات کافی دیر سنتا رہا۔ وہ سمجھ رہے تھے جیسے "موم پھل" رہا ہے۔ مگر میں نے آخر میں جب کہا "دیکھو یا رو! تمہاری ساری باتیں درست ہیں مگر اس شعر کا کیا ہو گا" اس پر سب یک زبان ہو کر بولے "کون سا شعر" میں نے کہا بھی یہ والا شعر۔

اگر مرزا ہوتا خدا کا نبی

تو "نبی" میں مگر کر نہ مارتا کبھی

شعر کہنے کی دیر تھی، ان سب کی ساری چمک کافور ہو گئی۔ ان کے بیوست زدہ چہرے دیدنی تھے۔ اس کے بعد میرے مرزائی دوست مجھے تبلیغ کرنے سے محض اس وجہ سے گریز کرتے کہ میں ان کے "نبی" کی شخصیت اور شکل پر "پھبتیلیں نہ کسوں"۔

سکول میں اساتذہ کو تنخواہ انتہائی کم ملا کرتی تھی۔ وہ بے چارے ٹیوشن اور دیگر جزوقتی ذرائع سے نہ جانے کیسے اپنے گھر چلاتے اور اس کے ساتھ چندے دے کر مرزائیت کا دونخ بھی بھرتے تھے۔ اردو کے استاد احمد علی کی طرف سے ہمیں یہ ہدایت تھی کہ "اردو کے لئے پن کے پتے والی کاپی استعمال کی جائے" مجھے بڑی حیرت ہوتی کہ آخر اس کاپی میں کیا خاص خوبی ہے جو ماسٹر صاحب اس کے استعمال پر مصر ہیں۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ دراصل یہ کاپیاں وہ خود بناتے تھے۔

چودھری غلام رسول معاشرتی علوم پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ جغرافیہ پڑھاتے ہوئے دنیا کے نقشے سے مختلف مقامات اور ملک دکھا اور پڑھا رہے تھے۔ اچانک ہندوستان پر انگلی رکھ کر بولے "تو یہ ہے ہمارا ہندوستان" پوری کلاس یک زبان ہو کر بولی "ماسٹر صاحب! ہمارا ہندوستان نہیں ہمارا تو پاکستان ہے"۔ اس پر چودھری صاحب نے کہا "بھئی ہمارا ہندوستان کیوں نہیں، کیا وہاں ہمارا قادیان نہیں ہے؟" لڑکے بولے "جی ہے"۔ "تو پھر ہندوستان ہمارا ہندوستان ہوا یا نہیں؟"۔ چودھری صاحب نے کہا۔

جس پر پوری کلاس نے گونج دار آواز میں جواب دیا ”جی ہندوستان ہمارا ہے۔“ میں بھی وہاں موجود تھا اور یہ سن کر مرزائیت پر لعنت بھیج رہا تھا۔ چودھری صاحب نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ”دیکھو بھو! قادیان واپسی ہمارا مشن اور خواب ہے۔ اس لئے ہندوستان ہمارا ہے اپنے ذہن میں یہ بات رکھو کہ ہم نے ایک دن قادیان واپس جانا ہے اور وہی ہماری منزل ہے۔“ مجھے خاموش دیکھ کر میرے ایک ساتھی نے پوچھا ”تم کیا سوچ رہے ہو“ میں نے کہا ”میں تم لوگوں کی عقل پر ماتم کر رہا ہوں کہ تم لوگ اتنے پیارے ملک کو اپنا کہنے کے بجائے دشمن ملک کے گن گار رہے ہو۔“

ہماری کلاس میں ”محمود نظامی“ کا بیٹا کلیب ہارون پڑھا کرتا تھا۔ پہلے تو اس کا قیام بورڈنگ ہاؤس میں تھا بعد میں وہ اپنے گھروالوں کے ہمراہ مرزائی ہو کر ربوہ منتقل ہو گیا اور ”النفیس فلیٹس“ میں رہائش اختیار کی۔ کلیب فیملی کے مرزائی ہونے کی خبر قومی اخبارات میں چھپی تو پورا سکول اسے مبارک باد دینے ہماری کلاس میں آیا اور وہ یوں مبارک بادیں سمیٹ رہا تھا جیسے اس نے کوئی میدان مار لیا ہو۔ اس روز مجھے بہت دکھ ہوا کہ ایک اچھا بھلا مسلمان خاندان نہ جانے کیسے کفر کی گھاٹی میں اتر گیا ہے۔ میرے کلاس فیلو مجھے سمجھانے لگے ”دیکھو کلیب ہارون اور اس کے گھروالوں نے کتنا اچھا فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں بھی غور کرنا چاہئے۔“ میں نے کہا ”مجھے تو تم اور تمہارے ”نبی“ پر تین حرف بھیجنے چاہئیں۔ تمہارا کیا خیال ہے میں کسی کو جہنم جاتے دیکھ کر خود بھی اس کے پیچھے چل پڑوں گا۔ ہم تو کالی کملی والے کے غلام ہیں۔ ان پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں۔ جب تک یہ جذبہ زندہ ہے مرزا غلام احمد کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جاسکتا۔“

ہمارے ایک استاد ماسٹر نذیر احمد جن کا تعلق چنیوٹ کے ایک نواحی گاؤں سے تھا، وہ کسی مرزائی ملاں کے جھانے میں آکر مرزائیت قبول کر بیٹھے۔ گھروالوں سے غالباً ان کا تعلق تمام ہو چکا تھا۔ انہیں کلاس میں مرزائیت کا پرچار کرنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ ان کی شادی بھی ربوہ میں کرائی گئی تھی جس کے زعم میں وہ ہر وقت

مرزائیت کا حق نمک ادا کرنے پر تلے رہتے تھے۔ وہ ہمیں پڑھاتے تو حساب تھے، لیکن اپنے پیریڈ کے دوران کچھ نہ کچھ وقت مرزائیت بیانی پر بھی ضرور صرف کرتے تھے۔ ایک روز مرزا غلام احمد کی سیرت پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے پورا پیریڈ غارت کر دیا۔ مجھے سخت کوفت ہوتی تھی لیکن میں انہیں روک نہیں سکتا تھا۔ دوسرے وہ میرے ساتھ براہ راست ہم کلام بھی نہیں تھے۔ اس روز میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ ”مولانا! اس شخص نے تیرے سچے نبی کی جگہ اپنے ”جھوٹے نبی“ کا درجہ بلند کرنے کی انتہا کر دی ہے۔ اس کو سخت ترین سزا دے۔“ یہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی اللہ تعالیٰ نے میری التجا سن لی اور ماسٹر نذیر کو جسم پر عجیب و غریب دانے نکلنے شروع ہو گئے، جن سے پانی نکل کر جہاں لگتا فوراً ”دوسرا دانہ نکل آیا۔“ کچھ عرصہ بعد اس کا چہرہ مکمل دانے دار اور انتہائی مکروہ ہو گیا۔

چودھری غلام رسول جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے وہ جسمانی سزا کے بہت ماہر تھے۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ سزا دینے کے لئے ماتھے کے بالوں سے پکڑتے اور زمین پر پٹخ کر گرا دیتے اور اوپر سے گھونسوں، لاتوں اور ڈنڈوں کی بارش کر دیتے۔ ان کی مار کھانے والا کئی روز تک بستر پر پڑا رہتا تھا۔ ایک روز انہیں نہ جانے کیا ہو گیا اور غصے میں اپنے جھوٹے خاندان نبوت کے ایک سپوت پر بھی طبع آزمائی کر بیٹھے۔ مرزا انور کا بیٹا مرزا احسن بہت موٹا تھا۔ اس کو کوئی سوال نہ آیا تو چودھری صاحب نے اسے مذکورہ طریقے سے گرا کر دھن ڈالا۔ وہ بے ہوش ہونے والا ہو گیا۔ گھر جا کر اس نے بتایا تو اگلے روز مرزا انور نے سکول آ کر بھری کلاس میں چودھری صاحب کی ”مدرسہ“ ون کر دی اور دو تین تھپڑ لگا دیئے۔ پوری کلاس چودھری صاحب کی بے بسی دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ مرزا انور نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ موصوف کو سکول سے نکلوا دیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ چودھری صاحب کو لاہور میں مرزائیوں کے ایک ہوشل ”دارالاحمد“ کا وارڈن لگا دیا گیا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ بات قابل ذکر ہے کہ چودھری صاحب کی موصوف کی سخت ترین سزا کے باوجود ہمارے سکول میں ایک نام نہاد اصول کے تحت

بڑی سے بڑی سزا ڈنڈے تھی۔

ہمارے سکول میں بعض اچھے استاد بھی تھے جن میں سید سعادت علی شاہ صاحب اور عبدالرب صاحب شامل ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں مشہور تھا کہ دونوں ”نیم مرزائی“ ہیں۔ شاہ صاحب فزکس کیمسٹری اور ریاضی پڑھاتے تھے۔ ان کا طرزِ تکلم جتنا سخت تھا، دل کے وہ اتنے ہی نرم تھے۔ لڑکے ان کے طرزِ تدریس سے بہت خوش تھے۔ شاہ صاحب ۱۹۶۹ء کے بعد مرزائیت ترک کر کے مسلمان ہو گئے۔ جبکہ عبدالرب صاحب جو ہمیں ساتویں سے دسویں تک انگریزی پڑھاتے رہے وہ بھی بڑے نرم خو تھے۔ جال ہے جو کلاس میں مرزائیت کے بارے میں ایک لفظ بھی کہہ جائیں۔ تاہم ان کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ ابھی تک مرزائیت کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں یا نکل چکے ہیں۔

۱۹۶۵ء کے ہی آخری مہینوں میں مرزائی خلیفہ مرزا محمود احمد کا انتقال ہو گیا تو سکول کالج غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیے گئے۔ شہر میں مرزائیوں کا میلہ لگ گیا۔ دنوں تک میت کا دیدار کیا گیا۔ مرزائی لڑکے دعویٰ کرتے تھے کہ ”دیدار“ کرنے سابق صدر ایوب خان بھی آئے تھے۔ جھوٹی نبوت کے اس ستون کو ربوہ کی خود ساختہ جنت میں منوں مٹی تلے دفن کر کے جب دوبارہ سکول کھلے تو کلاس کے بے تکلف لڑکوں نے مجھے کہا ”دیکھا ہے مقام‘ ہمارے حضور کا‘ کتنی دنیا ان کا دیدار کرنے آئی‘ اگر ہمارے خلیفہ صاحب سچے نہ ہوتے تو انہیں یہ مرتبہ کیسے عطا ہوتا۔ اب بھی ملن لو۔“ میں ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اپنی رائے ہمیشہ کی طرح محفوظ رکھی اور نہایت مختصر سا جملہ کہا ”اوئے مرزے نوں دب آئے او“ میرا یہ کہنا تھا کہ چند لمحے پہلے مسکرانے والے ان لڑکوں کے چہرے غصے سے تمناٹھے۔ کچھ ہی دیر بعد یہ بات ”ٹاک آف دی سکول ہو گئی۔“ اساتذہ سمیت کئی طلبہ نے مجھ سے استفسار کیا جس پر میں نے کہا کہ ”کوئی غلط بات نہیں کی گئی ہماری بولی میں جب کسی شخص کو دفن کر دیا جائے تو ہم یہی کہتے ہیں ”دب آئے آں“ اس پر میرے اساتذہ نے مجھے سمجھانے کے انداز

میں کہا کہ ”آپ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ انہیں سپرد خاک کر دیا گیا ہے اور پھر اتنے عظیم انسان کے لئے تو اچھے کلمات استعمال کرنے چاہئیں۔“ میں نے کہا ”آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے لیکن موصوف میرے لئے عظیم نہیں تھے بلکہ ایک عام شخص تھے۔ چنانچہ میں نے ان کے لئے عام بات کہہ دی۔“ وہ لوگ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ یوں بظاہر بات دب گئی مگر بعد میں مجھے پتہ چلا کہ چھٹی کے بعد مجھے مارنے کا باقاعدہ پروگرام بن گیا تھا۔ لیکن سکول انتظامیہ نے روک دیا تھا۔

گھر آیا تو والد صاحب نے مجھ سے ساری صورت حال پوچھی اور کہا ”بات تو تم نے سچ کی ہے مگر ذرا محتاط رہا کرو۔ یہ لوگ انسان نہیں بھیڑیے ہیں۔“ بعد ازاں ابا جی کو سکول بلا کر ہیڈ ماسٹر ابراہیم نے کہا کہ ”آپ اپنے بچے کو سمجھائیں کہ وہ اس قسم کی متنازع بات نہ کیا کرے جس سے لڑائی جھگڑے کا خطرہ ہو“ ابا جی نے کہا آپ لوگ بھی یہ جو دعوت تبلیغ ”تلی“ پر لئے پھرتے ہیں، اس سے گریز کیا کریں۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ہمارے ایک استاد بشیر احمد جغرافیائی حالات پر لیکچر دے رہے تھے۔ بات بھارت کے متعلق چل نکلی تو وہ کہنے لگے ”بھارت ہمارے لئے پاکستان سے زیادہ اہم ہے۔ وہاں قادیان ہے جس میں ہمارے ”نبی“ دفن ہیں۔ اور ہمیں ایک دن وہاں لوٹ کر جانا ہے۔“ اس کی مثل دیتے ہوئے انہوں نے کہا ”مصلحہ خلیفہ اور دیگر مشاہیر کو ربوہ میں امانت“ دفن کیا گیا ہے جنہیں بعد ازاں حکومتیں لے جلا جائے گا۔“ اس پر انہوں نے اپنے خلیفہ مرزا محمود احمد کی ایک تقریر کا حوالہ بھی دیا جس میں کہا گیا تھا کہ ”ملکی تقسیم غلط طریقے سے ہوئی ہے۔ ہم اس تقسیم کو ختم کرانے اور پاک بھارت کے باہمی افتراق دور کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس عارضی تقسیم کو کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے گا اور ہندوستان اور پاکستان کو پھر سے اکٹھا بھارت بنا دیا جائے گا۔“

چلتی پھرتی لائبریری

ربوہ میں آئے ہوئے کئی مہینے گزر جانے کے باوجود میں شہر کے بیشتر راستوں سے نااہل تھا۔ ہمارا بیلدار طالب حسین مجھے سائیکل پر چھوڑنے اور لینے جاتا تھا۔ اس کی فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ وہ مجھے کلاس روم میں چھوڑتا اور وہیں سے واپس لے آتا۔ اس کے علاوہ ابا جی ہمیں گھر سے باہر نکلنے بھی نہیں دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ہمارے دونوں بیلدار متمیلا اور طالب حسین چھٹی پر تھے۔ مجھے سکول پیدل جانا پڑا۔ یہ دن میرے لئے بڑا مشکل تھا۔ میں گھر سے نکلا اور جدھر لڑکے جا رہے تھے، چلتا گیا اور بالآخر سکول پہنچ گیا۔ اس روز کے بعد ابا جی نے فیصلہ کیا کہ میں پیدل سکول جایا کروں۔ میں نے اس کے لئے راستے میں آنے والے مخصوص نشان و علامات اور مکان یاد کرنے شروع کر دیئے۔ جنہیں دیکھ کر مجھے بہت جلد سکول کا راستہ یاد ہو گیا۔ گھر سے نکلتا تو گلی کے پہلے موڑ کے بعد ایک گھر پر غلام رسول راجیکی کا بورڈ آویزاں تھا۔ اس کے بعد چودھری فرزند علی کا گھر پھر اسامہ کانچ اور آشیانہ کے پاس سے گزرتے ہوئے کچا بازار آ جاتا۔ یہاں سے مسجد اقصیٰ کی ملحقہ پہاڑی کی طرف سڑک مڑتی اور آگے ایک مکان پر جلی حروف میں ”مرزا غلام احمد“ کا ایک الہام ”مرزا غلام احمد کی ہے“ تحریر تھا۔ اس کے ساتھ ہی جامعہ احمدیہ تعلیم الاسلام سکول اور تسلیم الاسلام کالج تھے۔ چند روز کی مشق کے بعد راستہ یاد ہو گیا۔ بعد ازاں میں نے راستہ تبدیل کر کے ریلوے لائن کے کنارے کنارے آنا جانا شروع کر دیا۔ ان دنوں صبح کے وقت ریڈیو پر ٹیننگ کے طور پر تلاوت لگتی تھی۔ قاری صاحب جب لمبی آیات تلاوت کر کے سانس لیتے تو سامعین ”اللہ اللہ“ کہا کرتے تھے۔ اس کو سن کر ہمارے سکول میں اسمبلی کے دوران جب تلاوت ہوتی تو لڑکے اللہ اللہ کہنا شروع کر دیتے۔ اس پر ہمارے سیکنڈ ماسٹر چودھری غلام رسول کی طرف سے سخت سرزنش ہوئی۔ ان کا موقف

تھا کہ اس طرح ”اللہ اللہ“ کہنا بدعت ہے۔ لیکن لڑکے ان کی فہمیت کے بلوجود باز نہ آئے تو چودھری غلام رسول نے ڈنڈے سے اسمبلی میں شریک تمام لڑکوں کی اس قدر دھتائی کی کہ وہ اللہ کا نام لینا چھوڑ گئے۔ مرزائی اساتذہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اللہ کا ذکر جلی طور پر کرنا بدعت ہے۔ چنانچہ اس بدعت کی شدت سے مخالفت کی گئی۔

ایک بار ہماری کلاس چھٹی سی میں دو لڑکے آپس میں لڑ پڑے۔ لڑتے لڑتے دونوں مجھ پر گر پڑے۔ ایک نے دوسرے کو بازو پر کاٹ لیا لیکن اس کا ”چک“ اس کے حریف کے بازو پر لگنے کے بجائے میرے بازو کا قیمہ بنا گیا۔ میں تو بے ہوش ہو گیا۔ اگلے روز ابا جی سکول آئے اور اسمبلی میں ”چک“ دکھا دیا۔ اس وقت تو لڑکوں کو سزا اور والد صاحب سے معافی مانگ لی گئی لیکن بعد میں استاد چہ میگوئیاں کرتے رہے۔

”ایس منڈے نوں تے کنڈا وی لگ جاوے تو ایندا پیو مصیبت پادیندا ہے“
 ربوہ شہر میں کئی عجیب و غریب لوگ تھے جس میں مرزا منور کا بیٹا مرزا مظہر عرف میاں مجو قابل ذکر ہے۔ اس کا دماغی توازن درست نہیں تھا۔ انتہائی فریہ مرزا مظہر ہاتھوں میں اخبار، بغل میں کتابیں اور منہ میں پان رکھے شہر میں گھومتا رہتا تھا۔ اس کے شلوار کے پانچے ٹخنوں سے اوپر ہوتے جب کہ ایک ہاتھ میں چھڑی ہوتی تھی۔ لوگ اسے مذاقا ”چلتی پھرتی لائبریری کہا کرتے تھے۔ جو نبی کوئی اسے لائبریری کتا، مرزا مظہر کے منہ سے گالیاں اور کف برسا شروع ہو جایا کرتا تھا۔

ہماری کلاس میں ایک لڑکا جمال الدین نانگے والا بھی پڑھتا تھا جو سکول کے اوقات کے بعد نانگہ چلایا کرتا تھا۔ کئی بار وہ اپنا نانگہ سکول میں ہی لے آتا اور جو نبی چھٹی ہوتی، ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ اپنا نانگہ لے کر دھندے پر نکل جایا کرتا تھا۔ مجھے اسے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی کہ بیچارہ پڑھائی کے ساتھ محنت مزدوری بھی کرتا ہے مگر بعد میں پتہ چلا کہ جمال دین کے والدین نہایت تنگدست تھے۔ جمال الدین اپنے گزیر بسر کے علاوہ چندے کی بھرمار سے نیرو آزما ہونے کے لئے نانگہ چلایا کرتا تھا۔

ربوہ میں مسلمان سرکاری ملازمین کی تعداد بہت کم تھی۔ ہمارے علاوہ وہاں

دوست محمد ٹیلیفون سپرنٹنڈنٹ، لائن مین محمد شفیع، مولا بخش ڈاکیا اور سٹیشن ماسٹر شیخ مختار رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شیخ مختار کے بیٹے اسرار کو مسجد سے ٹوٹیاں اتارنے کے الزام میں مرزائیوں کے نام نہاد تھانے میں ڈال دیا گیا۔ شیخ مختار بہت پریشان ہوئے اور اباجی سے مدد طلب کی۔ اباجی شیخ صاحب کو لے کر مرزا منصور کے پاس گئے اور ان کی طبیعت صاف کر کے رکھ دی۔ مرزا منصور اباجی کو پیر جی کہا کرتے تھے۔ اباجی نے ان سے کہا ”مرزا صاحب! پہلے ہی آپ کے کفرستان میں کوئی مسلمان ملازم آنا پسند نہیں کرتا اور شامت اعمال سے اگر کوئی آ جاتا ہے تو آپ اس کو جھوٹے الزامات کے ذریعے تنگ کرتے ہیں۔“

مرزا منصور نے کہا ”پیر جی! کیا خطا ہو گئی ہے جو جناب کا پارا آسمان تک پہنچا ہوا ہے؟“

اباجی نے کہا ”مسجد سے ٹوٹیاں آپ کے ان امتیوں نے اتاری ہیں، جن سے چندے لے لے کر آپ لوگوں نے انہیں ”پھانک“ کر رکھا ہے اور الزام آپ نے ایک مسلمان سرکاری ملازم کے بچے پر لگا دیا ہے۔ آپ فوری طور پر ”اسرار“ کو اپنی پراسرار حراست سے آزاد کریں۔“

مرزا منصور نے مسکراتے ہوئے اپنے دربان کو حکم دیا ”میاں جلدی کرو اس لڑکے کو رہا کراؤ ورنہ پیر جی کچھ کر ڈالیں گے۔“

ریوہ شہر میں ریلوے اسٹیشن، گول بازار کے پھانک اور دار ضیافت کے پہلو میں ایک کچا کمرہ ہے جس کی بنیادیں انتہائی پکی ہیں۔ یہ وہ کمرہ ہے جہاں قیام پاکستان کے بعد ریوہ آنے پر مرزا محمود احمد نے قیام کیا تھا۔ اس یادگار کمرے کو پرستش کا مقام دے دیا گیا ہے۔ لوگ زیارت کے طور پر یہ کمرہ دیکھنے جاتے ہیں لیکن ”مرزائی امت“ کے پیشواؤں، پیروکاروں اور علمبرداروں کی تضاد فکر ملاحظہ ہو۔ اس کمرے کے ارد گرد کوئی امیر و کبیر خاندان مقیم نہیں بلکہ یہاں تیسرے درجے کے ”کمی کمین“ لوگ رہتے ہیں جن میں ہمارا ایک کلاس فیلو محمود احمد ٹمس عرف پوپو بھی رہتا تھا۔ جس کی والدہ کے

ساتھ ایک افریقی مبلغ نے شادی کی اور کئی بچوں کی شکل میں اسے مرزائیت کا داغ دے کر بھاگ گیا۔ وہ بیچاری بچوں کا ایک ”ترنڈ“ لے کر ”اپنے نبی کے یادگار کمرہ“ کے قرب میں مرزائیت کا ماتم کرتی تھی۔

ربوہ میں کئی دلچسپ کردار گلیوں میں مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ ایک شخص جسے ”درمٹ“ کہا جاتا تھا، وہ پورے شہر کے لوگوں کے آوازے سنتا اور جواباً ان پر گالیاں اور سنگ و خشت برسایا کرتا تھا۔ یہ نیم پاگل قسم کا انسان تھا جسے ربوہ کے مکینوں نے مکمل پاگل کر دیا تھا۔ نبوت کے ”تخت نشینوں کو کبھی بھول کر بھی اس شخص کے بارے میں خیال نہیں آتا تھا۔ حالانکہ صحت مندی کی حالت میں وہ بہت اچھا پیئٹر تھا اور بھٹی پیئٹر کے نام سے مشہور تھا۔

ایک اور ڈاڑھی والا ”الٹی بخش“ بھی تھا۔ پورے شہر میں وہ آگے اور لڑکے بلے اس کے پیچھے پیچھے ”پاگل پاگل“ کا شور مچاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کی جیبوں میں کٹھنوں کے چھتڑے، ہاتھوں میں روڑے اور زبان پر ”پھلڑ“ ہوتے جو وہ اپنی مرزائی امت کے نونماوں پر برساتا تھا۔ ان نونماوں پر جنہیں مرزا محمود احمد نے کچھ کہنے کے لئے کلام محمود تصنیف کیا تھا۔ قعر خلافت کے ارد گرد ایک اور دیوانہ شخص ہوتا جس کا نام مجھے یاد نہیں۔ کہتے ہیں بچپن میں اس کی ایک پالتو بلی بس کے نیچے آگئی۔ اس نے روتے ہوئے اپنی ماں سے کہا ”ماں بلی لوٹ پوٹ“ بس یہی بات اس کی چھیڑ بن گئی جس نے اسے دیوانہ بنا ڈالا۔

ربوہ میں لوگوں کے نام بھی عجیب و غریب ہوا کرتے تھے۔ عربوں کی نقالی میں یہ لوگ فریج کٹ داڑھی کی طرح نام بھی ان جیسے رکھا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ہمارے گھر کے قریب ایک مولوی صاحب رہتے تھے جنہیں ”مولوی پاوا“ کہا جاتا مگر ان کا اصل نام ابوالنیر نورالحق تھا۔ ایک شخص کا نام سراج الدین حبیب اللہ طارق تھا جبکہ ہمارے ایک کلاس فیلو کا نام آفتاب منیر احمد تھا۔

ربوہ میں ایک شخص عزیز راجیکی تھا جس کی وضع قطع دیکھ کر میں بہت حیران

ہوتا تھا۔ انتہائی لمبے قد کا بھاری بھر کم شخص سفید تہبند اور کتہ پہنا کرتا تھا جبکہ اس کے سر پر بہت بڑی سی سفید پگڑی ہوتی جس میں اس کا بڑا سا چہرہ چھپ کر رہ جاتا۔ سکموں کی طرح ڈاڑھی اور مونچھوں نے اس کے ہونٹ بھی چھپا رکھے تھے۔ کہا جاتا کہ یہ ”مرزا غلام احمد“ کے صحابی مولوی غلام رسول راجیکی کا بیٹا ہے۔ اس شخص کا مسلک ”سدومیت“ سے بڑا گہرا تعلق تھا اس کے جلو میں ہر وقت شہر کے ”نوخیز امرد“ گھوما کرتے تھے جن میں ملک خدا بخش ہرل تھانیدار کا بیٹا قاتل ذکر ہے۔

ربوہ کے اکثر لوگ ایک بات بڑی عقیدت سے سنایا کرتے تھے کہ ایک بار ان کے ”مرزا غلام احمد“ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کی برسات ہوئی تو مولوی نور الدین اور مرزا محمود احمد اور مرزا بشیر احمد ایم۔ اے نور کی اس میٹھا میں بھیگ گئے۔ بعد میں یہی برسات ایک بار مرزا محمود احمد پر ہوئی تو انہوں نے برستی برسات میں مرزا ناصر ڈاکٹر مرزا منور، مرزا مبارک، مرزا طاہر اور مرزا رفیع کو بلا لیا۔ جب یہ لوگ نور سے پوری طرح سیراب ہو گئے تو بھی نور کا مینہ برستا رہا۔ پھر چودھری ظفر اللہ خان کو بلایا گیا چنانچہ وہ بھی خدائی نور سے منور ہو گئے۔ مجھے یہ سن کر حیرانگی ہوتی کہ بھوک کے مارے اور پیسوں کو ترسے ہوئے بیوست زدہ مرزائی نہ جانے کس زعم یا مجبوری کے تحت ایسی خرافات سنتے، ان پر ایمان لاتے اور پھر ان کا پرچار کیا کرتے تھے۔

ربوہ سے سرگودھا جائیں تو لالیاں اور ۴۶ اڈے کے درمیان ایک ۵۸ چک ہے جس کو ”چک قصائیاں“ کہا جاتا ہے۔ یہ چک درحقیقت جسم فروشی کا اڈہ ہے جس کو اگر دیہی بازار حسن کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ہم جب سکول و کالج میں پڑھا کرتے تھے تو اکثر مرزائی لڑکے ایک دوسرے کو کہتے ”چلو شکار کے لئے چک قصائیاں چلیں“ تب میں سمجھتا تھا کہ یہ لوگ شاید پرندوں کے شکار کے لئے کسی گاؤں جانے کی بات کرتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اصل حقیقت کیا ہے یہ چک مرزائیوں نے اپنی تسکین کے لئے آباد کر رکھا تھا۔ دروغ برگردن راوی ہمارے ایک مرزائی کلاس فیلو جس کا نام قصدا ”میل لکھنا مناسب نہیں“ مجھے بتایا تھا کہ ماضی کی ایک اداکارہ ناصرہ کے بارے

میں کہا جاتا ہے کہ وہ ربوہ کے محلہ فیکٹری ایریا کے کسی تحصیلدار کی بیٹی تھی۔ جس زمانے کی یہ باتیں ہیں، تب ربوہ کی درس گاہوں کو مثل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے اور اس زمانے کے ربوہ سے فارغ التحصیل طلباء یہ بات بڑے وثوق سے بتا سکتے ہیں کہ ربوہ میں تعلیم کا معیار ملک بھر کے باقی تعلیمی اداروں جیسا ہی تھا۔ کوئی تخصیص نہیں تھی ماسوائے اس کے کہ جنسی تعلیم عام تھی۔ وقت سے پہلے ہر لڑکا وہ باتیں سیکھ جاتا تھا جو زندگی سنوارنے کی بجائے تباہ کر دیا کرتی ہیں۔ سکول و کالج کے ہوشل تو ”جنسی انسٹی ٹوشن“ تھے جہاں لڑکے لڑکیوں کو ”گے اور لڑبیں“ کلچر کی تعلیم کے علاوہ تربیت بھی دی جاتی تھی۔ لیکن ہوش و خرد سے عاری والدین نہ جانے کیوں اپنے بچوں کو گھروں سے دور جنسی درندوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ جامعہ نصرت کالج اور سکول کی لڑکیاں ہوشل کے بند دروازوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دیواریں پھاند کر جہاں مرضی ہو چلی جاتی اور خوش وقت ہو لیا کرتی تھیں۔ بلکہ بتانے والے بتاتے ہیں لڑکیوں کے ہاسٹل کے دروازے قصر خلافت کے دروازوں کے آگے سامنے رکھنے کے بھی کئی مقاصد ہیں۔

ربوہ میں بھونڈی نہایت تیاری سے کی جاتی تھی۔ لڑکے ٹیڈی پتلونیں پہن کر سائیکلوں پر شہر کی سڑکوں پر گھومتے اور سیاہ برقعوں میں ملبوس حوروں کو آنکھوں سے اشارہ کرتے۔ اگر بات بن جاتی تو ریل گاڑی میں بیٹھ کر چنیوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر چلے جاتے۔ یہاں انہیں دوسری طرف سے آنے والی ٹرین کی آمد تک کافی موقع مل جاتا۔ اس کے علاوہ چنیوٹ سرگودھا اور لائل پور کے سینما گھر ”ڈیٹ“ کے لئے بہترین مقالت تھے۔

”مرزائی مت“ کے پیروکاروں کو ”شیعہ مسلک“ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ یہ اپنے خاص خاص فنکشن خاص طور پر محرم کے ایام میں رکھا کرتے تھے۔ شادی بیاہ کی بیشتر تقاریب دسویں محرم کو ہوا کرتی تھیں۔ ان بد بختوں کا اس بارے میں موقف یہ تھا

کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی یزید کے ساتھ جنگ سیاسی تھی اور ایک نافرمان کے حاکم وقت کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر افسوس کرنا پرلے درجے کی بے وقوفی ہے۔ ہمارے سکول میں دسویں جماعت کی الوداعی پارٹی بھی دسویں محرم کو ہوئی جس میں ہم لوگوں نے احتجاجاً "شرکت نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ ماتم اور مجالس عزاء اور بالخصوص مجلس شام غریباں کا ربوہ میں زبردست مذاق اڑایا جاتا تھا۔ چمن عباس، چنیوٹ اور احمد نگر میں تعزیه اور ذوالجناح کے جلوس نکلتے تو خدام الاحمدیہ کے شیر جوان خاص طور پر وہاں بھونڈی کرنے کے لئے جاتے اور اگلے روز اپنی خباثت کے قہے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ حالانکہ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے جلسہ سالانہ پر ان کی حوریں "اڑانے" کے لئے باہر سے ربوہ میں کون کون آتا تھا لیکن وہ یہ نہیں سوچتے تھے کیونکہ ورٹے میں ملی ہوئی بے غیرتی کے باعث شرم اس امت سے کوسوں دور تھی۔

ایک مرزائی مبلغ جو پہلے سکھ تھا، بعد میں بھی خود کو "گیانی" ہی کہلاتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھے اور میرے چند دوستوں کو کہا کہ آپ لوگوں کو ابھی تک "احمدیت" کی تبلیغ کسی نے اچھے طریقے سے کی نہیں۔ اس لئے آپ "مرزا غلام احمد" کی تعلیمات کو سمجھ نہیں سکے۔ لہذا آج میں آپ کو بتاتا ہوں کہ "احمدیت" کیا ہے۔ ہم خاموش اور ہمہ تن گوش ہو گئے اور دل میں سوچ لیا کہ "مرزائی مت" کے اس علمبردار کی مت مار کر ہی رہیں گے۔ ہمارے بزرگ دوست چودھری غلام رسول آف سرگودھا نے اس بد بخت کی تمام باتیں سن کر کہا "باباجی! آپ کی عمر کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ہاتھ کی بجائے صرف زبان سے بات ہو سکتی ہے۔ لہذا سنو! تمہارا جھوٹا نبی اگر کسی جھوٹے پیر کے طور پر اہل روحانیت کا دعویٰ کرتا، ہم قبول کر لیتے۔ کیونکہ ملک بھر میں بے شمار "ڈبے پیر" موجود ہیں لیکن اس نے تو لمبی چٹاننگ جا لگائی اور "نبی بن بیٹھا" تو باباجی ہم اسے کیسے مانیں۔ اور تم تو مرزائی ہونے کے بجائے سکھ رہتے تو زیادہ اچھا تھا کم از کم کسی ٹھوس مذہب پر تو قائم تھے۔ چودھری غلام سول کی باتیں سن کر "بڈھا سکھ" لمبی سی "ہوں" کر کے رہ گیا۔

بے وفادوست سے کے ٹو سگریٹ اچھا

ازل سے آج تک دنیا کے ہر معاشرے میں تین قوتوں کی حکمرانی رہی ہے جن میں حکام، مذہبی اکابرین اور طبیب شامل ہیں۔ تینوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ مذہبی اکابر حکام کی ہرچی جھوٹی بات کی تائید کر کے انہیں من مانی کا موقع دیتے ہیں جبکہ حکام اہل مذہب کو مالی امداد فراہم کرتے ہیں اور طبیب دونوں فریقوں کو جسمانی، ذہنی اور جنسی طور پر صحت مند رہنے کے لئے نسخے اور کشتے مہیا کرتے ہیں۔ انگریز کو ہندوستان پر پورا تسلط حاصل ہونے کے باوجود بھی مسلمانوں سے ہمیشہ خطرہ رہا ہے۔ خود کو مضبوط کرنے اور مسلمانوں میں دراڑیں ڈالنے کے لئے اس نے جب کسی مذہبی حوالے اور دھڑے کی شدت سے ضرورت محسوس کی تو مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی بنا کر لا کھڑا کیا۔ ان دونوں قوتوں کو شیطان دوستی میں مزید آگے لے جانے کے لئے بھیرہ نژاد حکیم مولوی نور الدین نے اپنی تمام تر ذہنی اور طبی صلاحیتیں صرف کر کے ایک مرزائی معاشرے کو جنم دیا۔ مرزائیت کے قیام کو دوام بخشنے کے لئے مرزا غلام قادیانی اس کے برگ و بار اور خلفاء کو مرزائی علماء نے دلائل و براہین سے سچا ثابت کیا اور انگریز سے دولت کے ڈھیر سمیٹے جب کہ ان دونوں حلقوں کی ذہنی، جسمانی اور جنسی آبیاری کے لئے طبیبوں اور ویدوں کے ٹولے نے اپنی اپنی خدمات انجام دیں۔ ربوہ شہر میں ایسی علاج کرنے والے حکماء کی بکثرت دکانیں ہیں۔ کہنے والوں کے مطابق حکیم نور الدین کا مرزائی خاندان نبوت اور امت پر بڑا احسان ہے۔ اس کی ادویہ نے ”مرزا غلام احمد کی ڈھلتی ہوئی جنسی قوتوں کو سنبھالا دیا اور نسخہ ”زوجام عشق“ کے زور سے مرزا محمود احمد اور مرزا بشیر احمد ایم۔ اے پیدا ہوئے۔

گول بازار میں دواخانہ خدمت خلق، دواخانہ حکیم نظام جان اور خورشید یونانی دواخانہ بہت بڑے ایسی ادویہ کے مراکز ہیں۔ اس کے علاوہ شہر میں کئی چھوٹے چھوٹے

مطب بھی موجود تھے۔ جن میں حکیم رانجھا اور حکیم عبد الحمید سنیا سی کا مکتبہ فیض عام بہت مشہور تھے۔ کھلنڈرے لڑکے اکثر ”فیض عام کو قبض عام“ کہہ کر حمید سنیا سی کو چھیڑتے اور مادر و خواہر کی مغالطات سنا کرتے تھے۔

مذکورہ دواخانوں میں زیادہ تر قوت مردی میں اضافے کی ادویہ فروخت ہوتی تھیں۔ ہر دوسری دوا پر ”نسخہ حضرت خلیفہ اول“ تحریر کر دیا جاتا جس کی کشش سے دوا کی خریداری میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ ”مرزا غلام احمد“ کے بارے میں مشہور ہے کہ ان پر جنسی قوت بڑھانے کا خط سوار تھا۔ ان کی تقلید میں مرزائی امت کے مرد بھی ہر وقت جنسی کمزوری دور کرنے اور قوت مردی بڑھانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ یہ انہی نسخوں کا ہی اعجاز و اکرام ہے کہ مرزائی تعداد ازدواج اور کثرت اولاد کے دل دادہ ہیں۔ حکماء کا خاصہ ہے کہ وہ جب بھی کوئی ”بم“ قسم کا نسخہ تیار کرتے ہیں تو پہلے خود استعمال کرتے ہیں۔ اسی بناء پر دواخانہ خدمت خلق کے حکیم بشیر اور دواخانہ نظام جان کے حکیم نذیر کے گھروں میں بچوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ دیگر حکماء بھی اپنے اپنے کشتوں کی برکت سے خاصے عیال دار تھے۔ جنسی ادویہ کے علاوہ نور کاہل، محبوب کاہل اور سرمہ نور بھی مولوی نور الدین کے نسخے قرار دیے جاتے اور ان سے چاندی حاصل کی جاتی۔ حکیم نذیر کی پیٹ درد کے لئے تیار کی گئی دوا ”ہانمون“ بہت مشہور تھی۔ جس کے لئے انہوں نے ایک نظم بھی لکھی تھی۔

ہانمون کیا خوب دوائی
روے وچ حکیم بنائی

بڑے بڑے مگرچہ قسم کے حکماء کو ”مرزائی خاندان“ کی سرپرستی حاصل تھی لیکن خلی سطح کے طبیب نہایت تنگ دست تھے۔ جنہیں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے رہتے تھے۔ حکیم صدیق نے ابا جی سے اپنی کسمپرسی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ”ہم پر تو کوئی ایسا عذاب الہی نازل ہے کہ کسی کو مفت دوا دیں تو فوراً آرام آ جاتا ہے لیکن مول دوا لینے والوں کو معمولی افاتہ بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تو لوگوں کو دوا کی

قیمت واپس کرنی پڑتی ہے۔ بڑے حکیموں کے بھی اکثر نسخے ناکام تھے۔ مگر ان کا ”کلا“ بہت مضبوط تھا۔ دواخانہ خدمت غلق والوں کا کیل مہاسوں سے نجات دلانے والا ”بیوٹی لوشن“ انتہائی خطرناک تھا۔ ایک بار ایک خاتون نے استعمال کیا تو وہ خطرناک الرجی کا شکار ہو گئی جو بمشکل اور بسیار ڈاکٹری علاج سے ٹھیک ہوئی مگر اس کے چہرے پر نشان عمر بھر موجود رہے۔

جہاں ربوہ میں ایک طرف ”حکیم راج“ تھا تو دوسری طرف زچہ بچہ کے بھی کئی چھوٹے بڑے کلینک کھلے ہوئے تھے۔ جنہیں عطائی قسم کی دایاں چلاتی تھیں۔ دو کلینک بہر حال بڑے اور مشہور تھے۔ جن میں ایک ”اقبال زنانہ دواخانہ“ تھا جو محلہ دارالرحمت وسطی میں کچے بازار اور پرائمری سکول کے قریب واقع تھا۔ ربوہ میں طبقاتی فرق ملک بھر میں سب سے زیادہ تھا جس کی بناء پر اعلیٰ درجے کے گھرانوں کی خواتین تو اپنے زچگی کے مراحل بڑے شہروں کے بڑے ہسپتالوں میں سر کیا کرتی تھیں۔ درمیانے سفارشی اور منہ لگے طبقے کی خواتین کے لئے فضل عمر ہسپتال میں بھی مراعات و سہولیات میسر تھیں۔ لیکن نچلا اور تیسرے درجے کا طبقہ بہر حال روایتی دایوں اور مذکورہ دواخانوں کے سہارے چلتا تھا۔ ان دواخانوں میں زچگی کے امور کے علاوہ اسقاط حمل کے کیس بھی نمٹائے جاتے تھے۔ اقبال زنانہ دواخانہ کی مالک رضیہ اقبال اپنے بیٹے کی معاونت سے یہ کلینک چلا رہی تھی۔ اس کے بیٹے کی رحمت بازار میں جوتوں کی دکان ”نعیم پیپی ہاؤس“ تھی۔ اس کے علاوہ گول بازار کے ریلوے پھانک سے ملحقہ پہاڑیوں کے دامن میں ایک مختاری دائی کا میٹرنٹی ہوم تھا۔ یہاں بھی خواتین اپنے زچگی کے مراحل سے گزرتی تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سے بالا بلند اور نام نہاد شرفاء شہینہ مشاغل سے پیدا ہونے والے مسائل کے ازالہ کے لئے بھی ان **کلینکوں** سے رجوع کرتے تھے۔ دارالرحمت وسطیٰ میں ہمارا ایک کلاس فیلو صابر علی رہتا تھا۔ سیاہ رنگ کا یہ مرزائی بے زار انسان باتیں کھری کھری کرتا تھا۔ اس نے رضیہ اقبال کے بارے میں بتایا کہ موصوفہ اگرچہ ایک غیر مستند دائی ہے لیکن قادیان کی

ظلی نبوت کی پیداوار کی تختہ مشق بنائی ہوئی ”امتی“ عورتوں کی مشکلات بہر حال آسان کر دیا کرتی ہے۔ اس کے بدلے میں اس نام نہاد ڈاکٹرنی کو ستم رسیدگان سے فیس اور ”اوپر والوں“ سے انعام بھی ملتا ہے۔

طلاق ربوہ میں جس قدر عام تھی، اس کی مثال کسی اور معاشرے میں بہت ہی کم ملتی ہے۔ یہاں مرد اور عورتیں دونوں طلاق کو مرضی کے مطابق استعمال کر لیتے تھے۔ ہمارے سکول کے ایک ٹیچر اسماعیل صاحب کے فلاسفی کے پروفیسر بیٹے مبارک احمد کی شادی ہوئی تو سہاگ رات کو ہی لڑکی نے لڑکے کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا اور اگلے ہی روز دونوں میں طلاق ہو گئی اور اسی ہفتے دونوں کی نئی شادیاں کر دی گئیں۔ طلاق کے بعد خواتین میں عدت گزارنے کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے اپنی منکوحہ افتخار بیگم کو محض اس بناء پر طلاق دے دی کہ اس کو کسی اور لڑکی سے محبت تھی جبکہ اس کا باپ اس لڑکی کو صرف اپنے اغراض و مقاصد کے لئے ”بہو“ بنا کر لانا چاہتا تھا۔ اس شخص نے اپنی منکوحہ کو طلاق کے ساتھ تحریر کئے جانے والے خط میں لکھا ”ہمارے معاشرے میں سر کا بہو کے ساتھ تعلقات استوار کر لینا معمول کی کارروائی ہے۔ لہذا میں آپ کو اپنے باپ کے چنگل سے بچانے کے لئے طلاق دے رہا ہوں“ یہ واقعہ بھی محلہ دارالرحمت شرقی کی ایک مکین لڑکی سے پیش آیا۔

طلاق اور خلع کے معاملات کو حل کرنے والی ربوہ کی متعلقہ انتظامیہ کا خاصا ہے کہ وہ ایک ہی نشست میں طلاق کا فیصلہ کر دیتی اور کھڑے پاؤں لڑکی اور لڑکے کے لئے نئے رشتے تجویز کر دیتی جنہیں فریقین اکثر قبول کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق کے معز اثرات کو محسوس کیا جاتا اور نہ ہی اس سے بچاؤ کے لئے عملی اقدام کیے جاتے تھے۔

اکثر مرزائی عورتیں شوقیہ طلاق بھی لے لیتی تھیں۔ ایسی کئی مثالیں دیکھی گئی ہیں۔ ایک شخص عبدالواسع کی بہن نے جب کسی ٹھوس وجوہ کے بغیر طلاق لے لی تو

ہمارے ایک کلاس فیلو محمود نے اس بارے میں بتایا کہ مذکورہ خاتون ازدواجی بندھن کی قائل نہیں تھی۔ اس نے گھروالوں کے مجبور کرنے پر شادی کی اور ایک ”پچہ“ حاصل کرنے کے بعد شوہر اور سسرال سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ محمود کے مطابق ربوہ سے وابستہ اکثر تعلیم یافتہ خواتین میں یہی رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ صرف پچہ حاصل کرنا چاہتی ہیں تاکہ معاشرے میں ان سے ”تنہا عورت“ کا لیبل اتر جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ کسی بھی عام شخص سے شادی کر لیتی ہیں اور مقصد حاصل ہوتے ہی کسی بھی بات کو جواز بنا کر نجات حاصل کر لیتی ہیں۔

ربوہ میں طلاقوں کی ایک اور وجہ بھی ہے جس پر مرزائی بے زار افراد کی اکثریت پوری طرح متفق ہے۔ ان لوگوں کے مطابق مرزائی امت کے مرد حضرات اپنے پیشوا اور اس کی آل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ”سدومیت“ کے اس قدر رسیا ہیں کہ وہ بیویوں کو بھی تختہ مشق بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ بعض خواتین اپنی مجبوریوں کے باعث سر تسلیم خم کر لیتی ہیں جب کہ اکثریت اس پر طلاق کو ترجیح دیتی ہیں۔ ہمارے محلہ میں ایک خاتون بشریٰ نے محض اسی وجہ سے طلاق لے لی کہ وہ شوہر کی یہ خواہشات پوری کرنے سے قاصر تھی۔

ہمارے سکول کے ایک استاد کی شادی بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون سے ہوئی جو پائے کی ریاضی ان کے لئے موصوف استاد سے شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد طلاق لے لی۔ بارے میں بھی یہی سننے میں آیا کہ خاتون اپنے شوہر نامدار کی نسبت کو پورا نہیں کر سکتی تھی، جو وہ اس کے ساتھ اپنی امت کی مسلمہ روایت کے طور پر ادا کرنا چاہتا تھا۔ جھوٹ وہ معاشرتی بیماری ہے جو کسی بھی معاشرے کی تمام اچھی اقدار کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ قادیانی نبوت کی بنیاد ہی جھوٹ ہے۔ لہذا یہ امت ہمہ وقت جھوٹ بولنا اپنا ایمان سمجھتی تھی۔ بڑے بڑے اکابرین اپنی کسی ہوئی باتوں سے یوں مکر جاتے ہیں جیسے وہ بات کسی گئی ہی نہیں تھی۔ ایک شخص چودھری نذیر خان ایک بار ہمارے گھر آیا اور کہنے لگا کہ ”میرا بھائی اور بھالی مختار احمد ایاز اور

صالح بیگم جماعت کے مبلغ ہیں اور دونوں نے میرے حصے کی جائیداد ہتھیا کر اپنے نام کرائی ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ یہ جائیداد موروثی نہیں بلکہ ان کی اپنی خریدی ہوئی ہے۔“ اباجی نے اسے کہا ”تم اس بارے میں کوئی ثبوت پیش کرو کہ جائیداد کے تم بھی وارث ہو“ کہنے لگا ان لوگوں نے باپ کی بیماری کے زمانے میں ہر چیز اپنے نام کرا لی تھی۔ اب ثبوت تو میرے پاس ہے نہیں، بات قسم کی ہے مگر یہ لوگ جھوٹی قسم کھانے سے دریغ نہیں کرتے۔

ہماری گلی میں ایک حکیم صدیق آف میانی والے قیام پذیر تھے۔ ان کا بیٹا شریف صدیقی ایک بے روزگار نوجوان تھا۔ اس کو گھر میں کوئی وقعت حاصل تھی نہ گھر سے باہر اس کی کوئی عزت کرتا تھا۔ اس کا ”ہینڈ رائٹنگ“ بہت عمدہ تھا۔ وہ اباجی کا بے حد احترام کرتا تھا۔ چنانچہ مجھے جب بھی سکول کے لئے چارٹ بنوانا ہوتا، اسے کہا جاتا۔ وہ بنا دیتا تھا۔ ایک بار میں نے اس سے پوچھا ”آپ کو نوکری کیوں نہیں ملتی؟“ کہنے لگا ”بھیا! میں نوکری حاصل کرنے کے قابل نہیں۔“ میں نے پوچھا آپ پڑھے لکھے ہیں پھر کیا وجہ ہے نوکری نہ ملنے کی۔“ کہنے لگا ربوہ میں نوکری حاصل کرنے کے لئے منافقت کی ڈگری ہونا ضروری ہے۔ زہر کو قد کہنے کا فن جسے آتا ہو، وہ شجر احمدیت کے اثمار سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ میری مجبوری ہے کہ میں احمدی ہو کر بھی اپنی آل نبوت اور امت کے ساتھیوں کی برائیوں اور خطاؤں سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ اپنے والدین، متعصب بھائیوں، محلے کے صدر اور جماعت کے اکابرین کے سامنے غلط کو غلط کہتا ہوں اور یہ چیز ان لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ لہذا مجھ سے میرے گھر والے خوش ہیں نہ جماعت والے راضی۔ پھر مجھے نوکری خاک ملے گی؟“۔

ربوہ میں چڑے شکار کرنے کا رواج عام تھا۔ ہر گھر میں لوگ مرغیاں ”ٹاؤنے“ والے ٹوکڑے کو ایک چھڑی کے سارے اس طرح کھڑا کر دیتے کہ نیچے ایک خلا سا بن جاتا جہاں باجرہ بکھیر دیا جاتا تھا۔ جوٹسی چڑیا یا چڑا دانہ چگنے ٹوکڑے کے نیچے جاتا، ٹوکڑے کے ساتھ بندھی ہوئی رسی کھینچ لی جاتی۔ یوں بیچارہ چڑا مقید ہو جاتا

جس کو پکڑ کر ذبح کر لیا جاتا تھا۔ ربوہ والے کہتے تھے کہ وہ چڑے بھی اپنے ”نبی“ کی سنت کے طور پر کھاتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ مرزا غلام احمد چڑے پکڑتے اور انہیں سرکنڈے سے نہایت اذیت دہ طریقہ سے ذبح کیا کرتے تھے۔ ان کے امتی اس معاملہ میں قدرے رحم دل واقع ہوئے تھے جو سرکنڈے کے بجائے چاقو سے چڑے ذبح کرتے تھے۔ ہمارے سکول کے ایک ماسٹر مسعود جن کی شکل انتہائی ہیبت ناک تھی، چڑوں کے بڑے رسیا تھے۔ وہ لڑکوں کو چڑے پکڑ کر لانے کو کہتے تھے اور جو لڑکا انہیں چڑے فراہم کرنے میں فراخ دلی سے کام لیتا، موصوف اسے نمبر دینے میں دریا دلی سے کام لیتے تھے۔ اس کے علاوہ ربوہ میں تلیر، شارک، لالی اور کبوتروں کا شکار بھی بہت کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ شکار کے لئے ایئرگن کے علاوہ غلیل بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی ہمیں بھی چڑوں کے شکار کا شوق ہوا۔ میں اور میرا کزن شکار کے ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے کہ اباجی کو خبر ہو گئی۔ اس کے بعد ہمارے ساتھ جو ہوا، اس کا نتیجہ بہر حال یہ تھا کہ پھر کبھی ”چڑا کشی“ کا خیال ہمارے ذہن میں نہیں آیا۔

ربوہ کے دکانداروں کا نپ تول اس قدر بددیانتی پر مبنی تھا کہ خود اہل ربوہ اپنے ہم مذہبوں پر اعتبار نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ سودا سلف لینے کے لئے چنیوٹ یا لالیاں جانے کو ترجیح دیتے تھے یا چمن عباس کے نذیر چنگڑ سے اشیاء ضرورت خرید کرتے تھے۔ شریف بٹ اور حفیظ سبزی فروش کے ساتھ اکثر لوگوں کا مول تول پر جھگڑا ہوا کرتا تھا اور تو اور یہ لوگ اپنی گندم پھوانے کے لئے ربوہ کی چکی پر جانے کی بجائے چمن عباس کے مسلمان چکی والے کے پاس جایا کرتے تھے۔ ان تمام حقائق سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا گیا گزاری معاشرتی اور سماجی طور طریق مرزائیوں سے ہزار گنا زیادہ اچھا ہے۔ کہ یہ لوگ خود حقیقی زندگی میں مسلمانوں پر ہی انحصار کیا کرتے تھے۔

اس شہر کے باسیوں میں گالیاں دینے کا عام رواج تھا۔ وہ لوگ کشتی نوح میں مرزا غلام قادیانی کی مسلمانوں کو دی گئی گالیوں پر بڑے نازاں تھے اور ان کی تہلیل میں

رکھٹ پر خود کشی کی کوشش کی۔ میوہپستال کی ایک نرس ناصرہ نے بھی پسند کی شادی کر لی۔ اور گھروالوں کو اس وقت بتایا جب وہ ماں بننے والی تھی۔ ”لو میرج“ یوں تو ہر معاشرے میں ہوتی ہے لیکن ربوہ کلچر میں اس کی نوعیت مختلف تھی۔ خاندان نبوت کے بڑے بوڑھے اور نوجوان تو جماعت کی کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے میں آزاد تھے۔ لیکن جماعت کے عام افراد پر پابندی تھی۔ گو وہ بھی اس پابندی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثریت اپنے والدین یا گھروالوں کو خبر کیے بغیر بھی شادیاں رچا لیا کرتی تھی۔

مرزا ناصر کے بھائی مرزا رفیق نے چنیوٹ کے ایک سابق ہیڈ ماسٹر جلیل شاہ کی بیٹی کو کسی طرح شیشے میں اتارا اور اس کے والدین کی رضامندی کے بغیر شادی کر لی۔ بعد ازاں جلیل شاہ کو دلفریب ملی آسودگی کی پیشکش کی گئی۔ جس پر موصوف نے مذہب اور عزت کو عیش و عشرت پر وار دیا اور اپنے پورے خاندان کے ساتھ ربوہ آ گیا۔ اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد ربوہ میں ٹیوشن سنٹر کھول لیا۔ وہ بزرگ داماد تعلیمی بورڈ کے ہم مذہب و ہم مشرب ارباب حل و عقد سے انگریزی کے گیس حاصل کر کے طلباء کو منتخب سوالات کروا اور بتا دیتا۔ امتحان میں وہی سوالات آ جاتے جس سے طلباء امتحان میں نمایاں کارنامے حاصل کر لیتے۔ اس طریق کار سے جلیل شاہ کے گھر ٹیوشن پڑھنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی لیکن سیاہ فام جلیل شاہ کا خاصا تھا کہ وہ لڑکوں کے بجائے لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھانے کو ترجیح دیا کرتا تھا۔ سارے دن میں لڑکیوں کی کئی کلاسیں لیتا جبکہ لڑکوں کی صرف ایک کلاس ہوا کرتی تھی۔

ربوہ کی ایک خاتون نیچر ایک سرکاری افسر کے دام محبت میں آ گئی موصوف پہنے ہی شادی شدہ اور ایک بیٹے کا باپ تھا۔ اس نیچر کو اس نے دوسری شادی کی دلچسپی کی تو اس نے شرط رکھ دی کہ پہلی بیوی کو طلاق دو پھر شادی کروں گی۔ کافی مدد کے بعد یہ شادی تو ہو گئی لیکن سرکاری افسر نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی اور بیٹے کو نخیل کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ طلاق دلوا کر شادی رچانے کا رواج بھی ربوہ

کی عورتوں میں عام تھا۔ جبکہ اکثر مرد بھی دوسروں کی بیویوں کو شیشے میں اتار کر طلاق پر راغب کر لیتے اور بعد میں شادی رچا لیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا۔ ربوہ میں طلاق کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کا اعجاز تھا کہ عائلی زندگی عدم استحکام کا شکار رہتی تھی۔

ربوہ میں قومی سطح پر باسکٹ بال کھیلنے کا بہت رواج تھا۔ سکول و کالج کی طرف سے ہر سال آل پاکستان ناصر باسکٹ بال ٹورنامنٹ کروایا جاتا تھا۔ جس میں ملک بھر کی مختلف نیس شرکت کرتی تھیں۔ ریلوے کی ٹیم کو بہت پذیرائی حاصل ہوتی تھی۔ اس ٹیم کے کپتان جاوید الحسن کو اہل ربوہ بہت پسند کرتے تھے۔ ربوہ کے اکثر نوجوان جاوید الحسن بن کر باسکٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ اکثر لڑکے کہا کرتے تھے کہ جاوید الحسن مرزا ناصر احمد کی خصوصی مربانیوں سے متاثر ہو کر مرزائی ہو چکا ہے۔ لیکن اصل حقیقت اللہ پاک جانتے ہیں۔ باسکٹ بال کے علاوہ ربوہ میں کرکٹ بھی کھیلی جاتی تھی۔ سکول کے زمانے میں ہمارے سکول کا چنیوٹ کے اصلاح ہائی سکول کے ساتھ اکثر میچ ہوا کرتا تھا جو چنیوٹ کی کمال گراؤنڈ میں کھیلا جاتا تھا۔ ہم سب لڑکے ریل گاڑی پر چنیوٹ جاتے اور میچ دیکھتے تھے۔ شہر میں عام طور پر لڑکے ”میرو ڈبہ“ ”پیٹھو گرم“ اور ”بندر کلا“ کھیلا کرتے تھے۔ جبکہ لڑکیاں ”شاپو“ کھیلتی تھیں۔

ہر محلہ میں اکثر و بیشتر جماعت کے کئی اجلاس ہوتے رہتے تھے۔ مرزائی مرکز کی طرف سے کوئی بھی ہدایت جاری ہونے کے بعد محلہ کے تمام افراد کو مساجد میں طلب کر لیا جاتا تھا۔ اس کے لئے ”میگا فون یعنی بھونپو“ پر لوگوں کو بلایا جاتا تھا۔ شہر میں عموماً ان الفاظ میں اعلان ہوتا تھا ”حضرات! اعلان کیا جاتا ہے کہ محلہ دارالرحمت غربی کے تمام مکیوں کا ایک اجلاس محلے کی مسجد میں صدر محلہ کی زیر صدارت بعد از نماز عصر ہو رہا ہے۔ تمام اہل محلہ اس میں اپنی شرکت کو ضروری بنائیں۔“

نماز کے اوقات میں شہر بھر کی دکانیں بند کر دی جاتی تھیں۔ دکاندار نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، دکان بہر حال بند رہتی تھی۔ ایک دکاندار جس کا ذکر پہلے بھی آچکا

ہے، وار الخیر جنرل سٹور کا مالک امین گاہوں سمیت دکن کے اندر رہتا اور دکن کا شہر گرا لیا کرتا تھا۔ چنانچہ جتنی دیر نماز ہوتی رہتی تھی، گاہوں کو بھی دکن میں بند رہنا پڑتا تھا۔ شہر بھر میں دیواروں پر فضول قسم کی باتیں لکھنے کا بھی بہت رواج تھا۔ خوبصورت لڑکے کو وہاں کے لوگ اپنی کسی مخصوص اصطلاح میں ”کے ٹو“ کہا کرتے تھے۔ ہمارا ایک دوست عبدالسمیع سہیل جو سرگودھا سے آیا تھا، اس کے حسن کے بہت چمچے تھے۔ ہر دیوار پر جلی حروف میں لکھا ہوتا تھا ”ربوہ کا مشہور و معروف تحفہ سہیل کے ٹو“ اہل شہر کو ”کے ٹو“ سے کیا نسبت تھی، اس کا مجھے آج تک علم نہیں ہو سکا۔ تاہم کئی دیواروں پر یہ الفاظ بھی تحریر ہوتے تھے کہ ”بے وفا دوست سے کے ٹو سگریٹ اچھے ہوتے ہیں۔“

لوگوں کو گھر سے بلانے کے لئے عجیب طریق کار مروج تھا۔ جب کوئی شخص کسی کے گھر جاتا تو دروازہ ”ناک“ نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ ہر گھر ”کل بیل“ بھی لگی ہوتی تھی۔ جانے والا دروازے کے باہر کھڑا ہو کر زور سے ”السلام علیکم“ کہتا جس کے جواب میں صاحب خانہ باہر آ جاتا تھا۔ مرزائی اس طریقہ کار کو مذہبی لحاظ سے انتہائی شائستہ عمل قرار دیتے تھے۔ دوسری طرف عالم یہ تھا کہ اگر کوئی شخص گھر سے باہر نہ آتا یا دروازہ نہ کھولتا تو آنے والا کسی بچے کی خدمات حاصل کرتا۔ بچہ دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوتا اور صاحب خانہ کو باہر آنے کے لئے کہتا۔ ”نہینہ“ اسے باہر لٹکنا ہی پڑتا۔ ان واقعات و حقائق سے یہ اندازہ لگانا نہایت آسان ہے کہ ربوہ کی معاشرتی زندگی کس قدر تضادات کا مجموعہ تھی جس کی بنا پر مرزائی امت کی منافقت کا بخوبی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

احقوں کی جنت

ربوہ سے کوٹ امیر شاہ جانے والے راستے پر پہاڑ کے دامن میں ایک وسیع و عرض چار دیواری ہے جس میں قبروں کا لامتناہی سلسلہ ہونے کے باوجود بہت سی زمین ابھی مزید قبروں کے لئے باقی ہے۔ یہ قبرستان مرزائیوں کی جنت ہے۔ اس چار دیواری کے پیٹ میں آنے والے مرزائی اپنی امت کے ”نام نہلو جنتی“ کہلاتے ہیں۔ اس قبرستان سے ملحقہ چار دیواری کے باہر سبزہ اور سلیہ دار درختوں سے محروم گورستان ان لوگوں کا ہے، جنہیں ”مرزائی پلو شاہ“ کی جنت حاصل نہیں ہوئی یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ وہ ”جنت“ حاصل نہیں کر سکے۔ دراصل ان لوگوں کو غالب کے بقول ”اس جنت“ کی حقیقت کا پتہ تھا چنانچہ انہوں نے محض دل کو خوش رکھنے کے لئے ”ایسی جنت“ کے حصول کے لئے پیر اور پر نہیں مارے۔

مرزائی امت کے ”جنتیوں“ کے اس مقبرے کو بہشتی مقبرہ کہتے ہیں جو مدینہ کے ”جنت البقیع“ کا مماثل تیار کرنے کے لئے بنایا گیا تھا اور یہ بھی اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ قادیانی امت اسلامی اصطلاحات اور شعائر اسلامی کی ایک نہایت بھونڈی نقل کر رہی ہے۔

مرزا غلام احمد کی نبوت باطلہ کی طرف بلانے والے پراپیگنڈے کے زور سے لوگوں کو اپنے دام فریب میں لاتے وقت ایسے طریقے سے ان کی ”برین واشنگ“ کر دیتے ہیں کہ ان کی حیثیت ایک رپوٹ کی سی ہو جاتی ہے۔ جنہیں وہ عمر بھر اپنے اشاروں پر نچلتے رہتے ہیں مگر ان کا احساس زیاں کبھی بیدار نہیں ہونے دیتے۔ ”مرزا غلام احمد“ نے اپنے زمانے میں تبلیغ کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ کسی بھی شخص کو بیعت کرتے وقت اس سے عہد لیا جاتا کہ وہ اپنے سگے اور خونی رشتہ داروں سمیت تمام ”مسلمانوں“ سے اس وقت تک کوئی تعلق نہیں رکھے گا جب تک وہ احمدی نہیں ہو

جاتے۔ حتیٰ کہ ان کے جنازوں میں بھی شریک نہیں ہو گا۔ اس کے علاوہ اپنی آمدن کو بھی اپنی مرضی کی طرح ”احمدیت“ کے لئے وقف کر دے گا۔ اس کے مل اور مزاج پر زندگی بھر اس نام نہاد نبوت کے ٹھیکداروں کا قبضہ رہے گا۔

مرزا غلام احمد کے خاندان نے اپنی اس ”غنڈہ گردی“ کو عملاً ”قائم رکھنے کے لئے امت پر بے شمار اقسام کے ”چندے“ یعنی **جمعہ ٹیکس** عائد کر رکھے ہیں۔ جن سے احمدی امت کے کسی فرد کو فرار حاصل نہیں۔ انہی چندوں میں ایک ”وصیت“ کا چندہ جو درحقیقت ”مرزائی جنت“ میں داخلے کا ٹکٹ ہے۔

”بہشتی مقبرے“ میں تمام قبریں ایک حادثے میں ترتیب سے بنائی گئی ہیں جن پر بالترتیب نمبر لگائے جاتے ہیں۔ قبروں کی شکل اس طرح ہے کہ ہر قبر کے کنارے پختہ اینٹوں سے بنائے گئے ہیں جبکہ اوپر سے قبر کچی رہتی ہے۔ تاہم اس کا کتبہ اچھا اور خوبصورت بنا ہوتا ہے۔ یہاں بھی ڈیزائن کا خیال رکھا گیا ہے کہ کوئی کتبہ دوسری قبروں کے کتبے سے مختلف نہیں۔ قبرستان میں ایک اور چھوٹی سی بے چھت چار دیواری ہے جس میں داخلے کے لئے ایک دروازہ لگا ہوا ہے جس کے اندر مرزا محمود احمد اور مرزا ناصر احمد سمیت مرزائی خاندان نبوت کے خاص خاص ”گرگوں“ کی قبریں ہیں جنہیں یہاں امانتاً دفن کیا گیا اور جو نہی ان لوگوں کو ربوہ سے قلیان جانے کی اجازت ملے گی، وہ ”دھرتی کے اس بوجھ“ کو یہاں سے اٹھا کر بھارت لے جائیں گے۔ یہاں یہ لکھنا بے جا نہیں ہو گا کہ اب جبکہ مرزائی خلیفہ مرزا طاہر جو کہ ”راجہ داہر“ بن کر مرزائی امت پر حکمرانی کر رہے ہیں لندن سے بے شمار دفعہ بھارت جاتے اور قلیان کے چکر لگاتے ہیں انہیں اپنے باپ بھائی سمیت دیگر لوگوں کی میتوں کو قلیان پہنچا دینا چاہئے تاکہ پاکستان کی سرزمین ان لوگوں کے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔

وصیت کرنے والوں کو ایک معقول رقم اپنی منقولہ غیر منقولہ جائیداد کے ۱/۴ کے برابر دے کر جنت کی ٹکٹ اور بہشتی مقبرہ کی قبر حاصل کرنا پڑتی ہے۔ ایسے لوگوں پر یہ پابندی ہے کہ یا تو وہ ساری رقم یک مشت ادا کر دیں یا پھر اقساط کی شکل میں

دیتے رہیں اور اگر اس دوران ان کا انتقال ہو جائے تو یہ رقم وہ شخص ادا کرے جس کو مرنے والا اپنی زندگی میں نامزد کرتا ہے۔

”بہشتی مقبرہ“ یعنی مرزائیوں کی جنت میں داخلے کی ٹکٹ کے بارے میں جب مقامی لوگوں سے دریافت کیا تو کئی ایک نے بیچ بچا کر وضاحت کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ ”خاندان نبوت“ کے کل پرزوں نے اپنی امت کو چاروں طرف سے لوٹنے کے لئے مختلف بہانے بنا رکھے ہیں۔ جنت کی ٹکٹ کی قیمت دراصل بہشتی مقبرے میں قبر کی زمین کی قیمت ہے جس کو جنت کی کنہی قرار دے کر اس کی بھاری قیمت لگا دی گئی۔ عقل مارے مرزائی بے شمار گنہ کرنے کے باوجود دولت کے زور پر جنت میں جانے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اسے مرزائیوں کی جنت کے بجائے احمقوں کی جنت کہا جائے تو بے جا نہیں ہو گا۔ وہ اس لئے کہ کوئی بھی شخص زندگی میں اپنی قبر کھود کر نہیں بیٹھتا۔ یہ درست ہے کہ کسی کو اپنی موت کی خبر نہیں، کوئی دم بھی دم آخر ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود ایک امید کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے لوگ موت کے بارے میں لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں سوچتے اور برسوں جیسے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ربوہ کی نبوت باطلہ کے پرچار کوں نے امت کی جیبیں خالی کرانے کے لئے انہیں زندگی میں اپنی قبریں بنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہشتی مقبرے میں قبر حاصل کرنے کا خواہشمند جب چندہ وصیت ادا کر دیتا ہے یا اس کی اقساط کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو اسے موصی نمبر اور وصیت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کے مرنے کے بعد نام نملو بہشتی مقبرہ میں اس کی قبر کی جگہ مخصوص ہو سکے۔ ایسے شخص کو مرزائی امت بہت خوش نصیب کہتی ہے۔

میاں عطاء الرحمن کے بیٹے لطف الرحمن محمود جن کا ذکر اس سے قبل بھی کیا گیا ہے، انہوں نے وصیت کی اور اپنی دولت اندھے کنوئیں میں پھینکنی شروع کر دی تو ان کے گھر عزیزوں رشتے داروں کا میلہ لگ گیا۔ ہر کوئی مبارک باد کے ڈونگرے برسا رہا تھا اور ان کے نصیب پر نازاں ہو رہا تھا۔ یہ منظر میں نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

جسے دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ ”کیا نادانی سی نادانی ہے۔“

عام معاشرے میں جس طرح ٹیکس گزار کسی جگہ اپنی حیثیت جتانے اور برتری منوانے کے لئے کہتے ہیں میں ”ٹیکس گزار“ ہوں اسی طرح ربوہ میں بھی جن لوگوں نے وصیت کی ہوتی اور جنت کا ٹوکن ان کی جیب میں ہوتا وہ ہر موقع پر اپنی حیثیت کا تذکرہ لے بیٹھتے اور کہتے ”میں موسیٰ ہوں“ گویا یہ بات ان لوگوں کا ”سٹیٹس سمبل“ بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے علاوہ مرزائیت کے لئے زندگی وقف کرنے والوں کی اکثریت نے اپنے گھر کے دروازے پر آویزاں نیم پلیٹ پر بھی یہ واقف زندگی کی ”ڈگری“ تحریر کر رکھی ہوتی تھی۔ یعنی منیر احمد سالک ”واقف زندگی“۔ علاوہ ازیں جنت کے ان مسافروں نے اپنے وزینٹنگ کارڈ پر بھی اپنا ”حیثیتی نشان“ رقم کر رکھا ہوتا تھا یعنی عطا المجید واقف زندگی۔ ایک دلچسپ بات جو بیان کرنا ناگزیر ہے وہ یہ کہ جن لوگوں نے زندگی وقف نہیں کرائی ہوئی ہوتی تھی، ان کو یہ واقف زندگی اور جنت کی ٹکنوں سے سخت چڑھتی۔ ایک بار غلہ منڈی کے بازار میں دو بوڑھوں کی لڑائی ہو گئی۔ دونوں نے خود کو ایک دوسرے سے برتر ثابت کرنے کے لئے کئی دلائل دینے کے علاوہ خاصی بھاری بھر کم مغفلت سے بھی کلام لیا لیکن ایک دوسرے کو چت نہ کر سکے۔ آخر کار ایک بوڑھے نے دور کی کوڑی لا کر کہا ”تم نہیں جانتے میں واقف زندگی ہوں واقف زندگی تیری میری کیا برابری“۔ اس پر پہلے بوڑھے نے نہایت مدلل جواب دیا جو اس کے حریف پر ہی نہیں، مرزائیت کے منہ پر بھی ایک طمانچہ ہے۔ کہنے لگا ”جا اوئے مورکھا! زندگی وچ ای اپنی قبر بنا لئی ای تے کسندا ایس میں واقف زندگی آں۔ اس جنت واکي فائدہ جڑی ہزاراں روپے دے کے لینی اے۔“ اس پر دونوں اطراف سے سیز فائر ہو گیا۔ کئی دکاندار اور راہ گیر جو اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے انہوں نے بھی موخر الذکر بابے کے ”کو منٹس“ پر کہا ”بھئی باباجی کسندے تے سچ نے۔“

مولوی احمد خان نسیم کے بارے میں پہلے بھی تحریر کیا گیا ہے یہ ایسا مبلغ تھا جو دیہاتیوں کو گھیر گھار کر مرزائیت میں لاتا اور ان کے مال و دولت سے اپنے جھوٹے نبی

کے خزانے بھرتا تھا۔ اس نے ایک شخص فیض محمد کو مرزائی کر لیا۔ یہ ایک کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ عقیدت کے چکر میں اس نے ربوہ میں اپنا گھر بنایا اور ہل بچے سمیت یہاں منتقل ہو گیا۔ اور اپنے قبیلہ برادری سے قطع تعلق کر لیا۔ اس نے بھی ربوہ والوں کو ہر قسم کا چندہ دینے کے علاوہ وصیت کر ڈالی۔ دولت کی فراوانی تھی تو چندے دینا کوئی مرنگا نہیں تھا۔ لیکن اچانک فیض محمد کو فصلوں سے آنے والی آمدن کم ہونے لگی۔ ان کے بھائیوں نے بھی زمین کے مقدمے جیت کر اسے اس کے حصے کی زمین سے محروم کر دیا۔ ربوہ میں اس کا ڈپارٹمنٹل سنور بھی خسارے میں چلا گیا۔ اس کو دال روٹی اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لالے پڑ گئے۔ لیکن چندوں کے ٹاگ منہ کھولے اسے ننگے کے لئے ہر گھڑی تیار رہتے تھے۔ جب بھی چندہ لینے والے ”ملاں عرف مہی“ آتے تو کہتے ”مہرجی اوکھے سوکھے ہو کے چندہ دیندے رہو“ اللہ خیراں کر دے گا۔ حالات کے ستائے ہوئے فیض محمد نے ایک روز چندہ لینے والے ”ملاں“ کو گریبان سے پکڑا اور مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ وہ ”مرزا غلام احمد“ اور اس کی آل کے علاوہ مولوی احمد خان نسیم کی تمام خواتین خانہ کے ساتھ اپنے تمام تر تعلق جوڑتا ہوا کہہ رہا تھا ”ایسی جنت کو سات سلام جو پیسوں سے ملے۔ میرے بچے بھوکے مر رہے ہیں اور ان ظالموں کو چندے کی پڑی ہے۔“ بہت سے بڑے بوڑھے مرزائیوں نے اسے سمجھانے اور استغفار کرنے کی تلقین کی کوشش کی مگر اس کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر انہیں ”چندے والے ملاں“ کا انجام یاد آ گیا جو فضل عمر ہسپتال کے ”مفلس وارڈ“ میں بے یار و مددگار پڑا تھا۔

کہتے ہیں ”قبرستان جا کر انسان کو موت یاد آتی ہے اور وہ زندگی کے سبق سیکھتا ہے۔ ربوہ کے ایک مکین خورشید احمد چیمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے موصوف واقف زندگی تھے۔ اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ کٹ کر مرزائی خاندان نبوت کا دونخ بھرتے تھے۔ مرزائیوں کے بہشت میں ان کی قبر کا رجسٹر نمبر بھی لگا دیا گیا تھا۔ ایک روز وہ اپنی قبر دیکھنے بہشتی مقبرے گئے تو قدرت کو ان کی سلوگی پر پیار آ گیا اور جس نے

انہیں ہدایت دینے کا وسیلہ بنا دیا۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ انہوں نے دیکھا کہ ان کی قبر میں کتا پیشاب کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں اس قدر نفرت ہوئی کہ انہوں نے ایسی جنت کا خیال دل سے نکل دیا اور چندوں کی رقوم عزیز و اقارب اور مرزائی نبوت اور اس کے خاندانوں پر تین حرف بھیج کر مسلمان ہو گئے۔

حوریں

ہم نے سن رکھا تھا کہ ربوہ میں جنت اور حوریں بھی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ کیسے جانا جائے کہ جنت دوزخ کہاں ہیں اور حوریں کدھر اور کیسی ہوتی ہیں۔ اباجی سے جو معلومات ملیں، ان سے جنت دوزخ کے بارے میں تو کچھ پتہ چل گیا مگر حوروں والا قصہ ابھی تک تشنہ بلکہ ناکمل تھا۔ کسی مرزائی لڑکے سے اس بارے میں دریافت کرنا بھی مشکل تھا۔ ہماری کلاس میں ایک لڑکا عبدالملک پڑھتا تھا۔ دیہاتی لب و لہجے کا یہ لڑکا مرزائیوں کے سخت خلاف تھا۔ مگر اپنے ہپ کی جائیداد سے محرومی کے خوف سے مرزائیت کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ ایک دن وہ مرزائیت اور اس کے ماننے والوں کے شجرہ نسب پر طبع آزمائی کر رہا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اس سے حوروں کے متعلق پوچھ ڈالا۔ غصے میں وہ پہلے ہی تھا۔ میرے استفسار پر اس نے حور و قصور کی پوری تفسیر بیان کر ڈالی۔ کہنے لگا:

”سونہیا! حوراں کلوھیاں نے، ربوے دیاں ساریاں کڑیاں نوں ای
حوراں کھندے نے، تاہم کچھ حوریں اصلی ہوتی ہیں بعض
نعلی۔“

پوچھا ”نعلی اور اصلی حوروں سے مراد“ جواب ملا ”یار! اصلی
حوراں مرجو آئیاں دیاں زنانیاں نے تے نعلی حوراں ہماراں دیاں
رناں نے۔“

مالک سے میں نے سوال کیا ان لوگوں کی خواتین اصلی اور تم والی نعلی حوریں
کیوں، اس پر وہ مسکرایا اور کہنے لگا ”بھائی اوہ اصلی دیسی گھی دیاں نے نا“ وہ اس طرح
کہ ہمارا نبی خواہ سچا ہے یا جھوٹا، اس سے قطع نظر نبی تو ہے نا۔ اب اس کی آل اولاد
میں جتنی لڑکیاں ہیں، وہ خوبصورت بھی ہیں، امیر بھی۔ ان کے لباس، شکل و صورت

اور نشست و برخاست ہماری عورتوں سے مختلف اور پرکشش ہے۔ چنانچہ انہیں اصلی حوریں ہی کہا جائے گا جبکہ ہماری عورتیں مرتبہ مقام اور جیب کے اعتبار سے ان جیسی تو نہیں ہیں لیکن اس نبی کی امت تو ہیں جسے ہم نے مان لیا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے حوروں والی صفات ہماری خواتین کے حصے میں بھی آتی ہیں۔“

اتنی معلومات ملنے کے بعد میں نے حوروں کے بارے میں خود بھی مشاہدہ کیا تو مجھے ربوہ کی ہر عورت حور ہی لگنے لگی۔ کیونکہ مرزائی عورتوں کا اپنی طرف متوجہ کرنے کا جو انداز ہے اس سے وہ خواہ مخواہ ہی حوریں لگتی تھیں۔ سیاہ رنگ کے ان کے برقع کی وضع قطع کچھ اس طرح کی ہوتی کہ ہر خاتون ”سیکس اپیلڈ“ نظر آتی تھی۔ برقع کا نچلا حصہ لمبا اور چنہ نما ہوتا جو کہنے کو برقع مگر اس میں ملبوس ہر خاتون ایک فتنہ خوابیدہ نظر آتی تھی۔ سر پر نکونی سکارف اور اس کے ساتھ دد نقاب اپنے اندر ایک طوفان چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر عورت ایک نقاب سے چرے کا نچلا حصہ ناک تک چھپا لیتی ہے جبکہ دد سرا نقاب سر پر پلیٹ لیا جاتا ہے۔ صرف آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں جو آنکھوں آنکھوں میں باتیں کر جاتی ہیں۔ بعض مہ جبین شہر آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا کر اچھی بھلی دشمن عقل و ایمان بن جاتی ہیں۔ اس گٹ اپ میں معمولی سی شکل و صورت والی عورتیں بھی ماہ لقا اور حور شامائل نظر آنے لگتی ہیں۔

مرزائی خاندان نبوت کی خواتین واقعی حسن و جمال کا پرتو ہیں ”عزازیلی“ حسن کی بنا پر ہی یہ جھوٹا مذہب چل رہا ہے۔ حسنینان ربوہ کو حوریں کہنا اگرچہ شاعری کے زمرے میں آتا ہے لیکن جس کسی نے شاعرانہ ترنگ میں مرزائی خواتین کو حوریں کہا ہے اس میں اس کی خرد قصور وار نہیں۔ یہ دست قدرت کا کمال ہے یا کالے برقع کی فسوں سازی جس نے وہاں کی ہر عورت کو حور بنا کر رکھ دیا ہے۔

مرزائی امت کے ارباب اقتدار اور شہر کے عوام الناس نے اپنے ہر قول و عمل پر منافقت کا لبلبہ چڑھا رکھا ہے۔ ربوہ کے معاشرے کو پاکیزہ اور مثالی ظاہر کرنے کے لئے مختلف ڈرامے بازیاں کی جاتیں۔ جن میں شہر کے ایک کونے پر جامعہ نصرت

گرلز کالج اور نصرت گرلز ہائی سکول اور دوسرے کونے پر لڑکوں کے تعلیم الاسلام ہائی سکول اور ٹی آئی کالج کی تعمیر قاتل ذکر ہے۔ اس تعمیر کی غایت بظاہر یہ تھی کہ باہر کی دنیا پر یہ ثابت کیا جائے کہ صنف نازک اور صنف کرخست کے تعلیمی اداروں میں انتہائی فاصلے ایک مثالی معاشرے کی شاندار مثال ہیں۔ لیکن ان کی منافقت اور ڈرامے بازی اس وقت انتہائی مضحکہ خیز ثابت ہوتی جب دریائے چناب، الف محلہ، دار نصرت، دار البرکت اور پہاڑی کے دامن میں واقع دارالین کی لڑکیاں اپنے سکول کالج کے لئے ریلوے لائن کے کنارے کنارے چلتی ہوئی آ رہی ہوتی جبکہ فیکٹری ایریا، محلہ دارالصدر، محلہ دارالرحمت غربی، شرقی، وسطی، ریلوے اسٹیشن کے علاقے کے لڑکے دریا کی طرف اپنے سکول و کالج جا رہے ہوتے تھے تو دونوں اصناف کا آپس میں کراس ہوتا۔ اس دوران بے شمار لڑکے لڑکیوں کے آپس میں مسکراہٹوں اور رقعوں کے تبادلوں ہو جاتے اور کسی کو کانوں کلن خبر بھی نہ ہوتی۔

ایک مرتبہ میں اور میرا کزن محمد شفیع ریلوے لائن میں چلتے ہوئے سکول جا رہے تھے۔ راستے میں ایک شیریں کو اپنے فرہاد کی نگاہوں سے بلائیں لیتے دیکھا تو لامحالہ ہمارا دھیان ادھر چلا گیا۔ اس محویت میں پیچھے سے آتے ہوئے ریلوے انجن کی آواز بھی نہ سنائی دی۔ قدرت کو ہماری زندگی مقصود تھی کہ انجن ابھی چند گز کے فاصلے پر تھا کہ ہم نے دائیں بائیں جانب چھلانگیں لگا کر جلن بچالی ورنہ ایک حور کے کمالات کا نظارہ ہمیں دوسری دنیا پہنچا چکا ہوتا۔

ربوہ کی ایک لڑکی کا نام نجمہ تھا جسے سب لوگ منجھی کہتے تھے۔ اس کی چنیوٹ کے ایک مسلمان لڑکے ظہیر احمد سے نہ جانے کیسے ملاقات ہو گئی اور اسے اپنا دیوانہ بنا لیا۔ یہ لڑکا یتیم تھا اور تعلیم حاصل کرنے ملتان سے اپنی بہن کے پاس چنیوٹ آیا ہوا تھا۔ ظہیر کے گھروالوں نے سنا ہوا تھا کہ ربوہ میں تعلیم بہت اچھی ہے۔ لہذا اسے فرسٹ ایئر میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ اس کی منجھی سے ملاقات ہوئی تو وہ ظہیر پر لٹو ہو گئی۔ دسمبر ٹیسٹ میں جب ظہیر میاں فیل ہو گئے تو اس کے گھروالوں

کا ماتھا ٹھنک۔ انہوں نے اپنے طور پر انکوائری کی تو معلوم ہوا کہ میاں صاحبزادے تو ایک حور کی زلفوں کے اسیر ہو چکے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، پہلے تو ان کی خوب دھنائی ہوئی مگر جب عشق کا بھوت ان کے سر سے اتارے نہ اترا تو موصوف کو گھر والوں نے واپس ملکن بھیج دیا۔

حوروں کے سب سے بڑے ”دو ڈپو“ مرزا محمود احمد کی بیویوں مرآپا اور مریم صدیقہ المعروف چھوٹی آپا کے گھروں میں تھے ”رحم سے خالی“ مرآپا کے پاس جماعت کی دیوداسیوں کی ایک فوج تھی جو بظاہر اس کی خدمت پر مامور تھی مگر درحقیقت وہ اپنے نبوت زادوں کی دبستی کا سلمان کرتیں یا احمدیت کے دام میں آنے والے نئے پنچھیوں کے پاؤں میں اپنی زلفوں کی بیڑیاں ڈالا کرتی تھیں۔

ربوہ کے تمام مرد و مقلات پر سر و نگاہ جھکا اور ہاتھ باندھ لیا کرتے تھے۔ ایک جب وہ اپنے خلیفہ، اس کی اولاد یا جھوٹے خاندان نبوت کے کسی بھی فرد کے سامنے پیش ہوتے، دوسرے اس وقت جب حوریں ان کے سامنے آتیں۔ ”ربوی مرد“ نکلیوں سے انہیں دیکھ تو لیتے مگر ان سے نظر ملانا نہ جانے کیوں ان کے بس میں نہیں ہوتا تھا۔ کئی ایک سے جب اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اپنے ”نبی“ کی نام نہاد تعلیمت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ”ہم اپنی مذہبی تربیت کی بنا پر عورتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے جبکہ عورتیں ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھ لیتی ہیں۔“

جامعہ نصرت کلج فار ویمن کی پرنسپل فرخندہ شاہ جو مسز شاہ کے نام سے مشہور تھیں ان کی مرزائیت کے لئے ”خدمات“ کو بہت سراہا جاتا تھا۔ ان کی علیمت کے علاوہ زبردست ڈسپلن کے قصیدے بھی قصر خلافت میں چار دانگ پڑھے جاتے تھے۔ ان کے بیٹے نے اپنی والدہ کو کلج میں سوشل ورک کا مضمون تعارف کرانے کا مشورہ دیا جسے قبول کر لیا گیا اور پھر بیٹے ہی کی سفارش پر ایک مسلمان لڑکی مس نجف کو سوشل ورک کی لیکچرار کے طور پر ملازمت دے دی گئی۔ اس مسلمان لیکچرار نے مسز شاہ کے سخت نظم و ضبط اور قصر خلافت میں نیک نامی پر پانی پھیر دیا۔ اور پرنسپل کے بیٹے کو پہلے

مسلمان کیا۔ بعد میں اس کے ساتھ شادی رچا کر اسے کفرستان سے لے کر نکل گئی۔
 قصر خلافت مسز شاہ اور حوریں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ حوروں کے سلسلے میں ایک دلچسپ
 بات جسے ہر شخص انجوائے کیا کرتا تھا کہ جامعہ نصرت گرلز کالج کی پرنسپل مسز شاہ نصرت
 گرلز ہائی سکول کی ہیڈ مسٹریس مسز بشیر اور فضل عمر فاؤنڈیشن انگلش میڈیم سکول کی
 پرنسپل تینوں بیوہ تھیں۔ اکثر لوگ از راہ مذاق کہا کرتے تھے کہ تینوں ”میڈموں“ نے
 نہ جانے کیوں اپنے شوہروں کو دنیا سے باجماعت رخصت کر دیا ہے اور مرزائی مرکز نے
 زنانہ تعلیمی اداروں کے لئے تین بیوائیں ہی کیوں منتخب کیں۔

ہمارے چنیوٹ کے ایک دوست کی بہن جو نصرت گرلز ہائی سکول کی طالبہ تھی
 اس کے گھر والوں نے چنیوٹ سے لاہور منتقل ہونا تھا چنانچہ اس نے آٹھویں جماعت
 پاس کرنے کے بعد نویں کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا چاہا مگر سکول کی ہیڈ مسٹریس مسز بشیر نے
 سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا اور کہا ”بچی لائق ہے اسے ہم میٹرک پاس کرنے تک
 سکول سے نہیں فارغ کریں گے۔“ سکول کے مینیجر چودھری علی اکبر ہمارے دوست
 مقصود الرحمن کے والد تھے ان کی سفارش کرائی مگر بے سود۔ آخر ہمارے ایک اور
 کلاس فیلو عبدالحمی طاہر دور کی کوڑی لائے انہوں نے یونائیٹڈ بینک کے مینیجر لطیف اکمل
 سے بات کی جنہوں نے ایک فون کیا اور اگلے ہی لمحے مسز بشیر نے سرٹیفکیٹ دینے کی
 حامی بھری۔ ہمارا کام تو ہو گیا مگر لطیف اکمل سے اس ان ہونی کے ہو جانے کے اسباب
 پوچھے تو انہوں نے آنکھ دبا کر کہا ”بھائی یاری کی کچھ تو پردہ داری ہونی چاہئے“

ایک مرتبہ ہمارے ایک جاننے والوں کی نصرت گرلز ہائی سکول کی طالبہ بیٹی
 نویں جماعت میں فیل ہو گئی۔ لڑکی کے والد نے سکول انتظامیہ سے ملنے کے بعد لڑکی
 کے پرچے دوبارہ چیک کر کے اسے رعایتی نمبر دلو کر پاس کرانے کی درخواست کی۔ اس
 سلسلے میں اس کی ملاقات لڑکی کی کلاس ٹیچر سے ہوئی جس نے لڑکی کے باپ کو بتایا کہ
 لڑکی کی نالائق کی وجہ اس کا چال چلن ہے۔ یہ اور اس کی سیلیوں کا گروپ کلاس
 سے اکثر غائب رہتا ہے اور یہ سب ایک دوسرے کے بوائے فرینڈز کو محبت نامے

پہنچنے اور ملاقاتیں اریخ کرانے میں مصروف رہتی ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پردھائی میں کمزور رہ گئی ہے۔ لڑکی کا والد جو پہلے ہی بیٹی کی ناکامی پر سرپیٹ رہا تھا، اب بیٹی کے مشکوک چال چلن کی خبر پر سخت پریشان ہو گیا۔ جب لڑکی اور اس کی سہیلیوں سے معلوم کیا گیا تو انہوں نے ایک اور ہی کہانی سنا ڈالی کہ موصوف ٹیچر کے خود کچھ مشکوک لوگوں کے ساتھ تعلقات ہیں اور وہ اپنی ”خوب رو“ طالبات کو ان لوگوں سے ملاقات پر مجبور کرتی ہے۔ اور جو لڑکیاں بات نہیں مانتی، انہیں نہ صرف کلاس میں زہج کیا جاتا ہے بلکہ امتحان میں بھی فیل کر دیا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ جب اعلیٰ سطح پر اٹھایا گیا تو سکول انتظامیہ نے یہ کہہ کر بات دبا دی کہ اس طرح اساتذہ اور طالبات کی بدنامی ہو گی۔ چنانچہ لڑکی کو پاس کر کے اگلی کلاس میں بھیج دیا گیا۔

ہمارے محلہ میں ایک لڑکا رفیق رہتا تھا جس کے اپنی پڑوسن اور میٹرک کی طالبہ جمیلہ سے تعلقات تھے دونوں کے والدین نے انہیں باز رکھنے کی بسیار کوشش کی مگر بے سود دونوں نے اپنی ڈگر سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ رفیق کا والد راج گیری کا کام کرتا تھا وہ اسے اپنے ساتھ کوئٹہ لے گیا جبکہ جمیلہ کے گھر والوں نے اس کی شادی کر دی۔ فریقین کا خیال تھا کہ دوری دونوں کے سروں سے عشق کا بھوت اتار دے گی۔ مگر مرض دوا کرنے کے ساتھ بڑھتا گیا اور رفیق باپ کو جل دے کر کوئٹہ سے چنیوٹ آ گیا اور ایک آٹو ورکشاپ میں کام سیکھنا شروع کر دیا۔ اس دوران رفیق اور جمیلہ کی ملاقاتیں پھر سے ہری ہو گئیں۔ چنانچہ جمیلہ نے طلاق، اور رفیق نے اپنے استاد کی مدد لے کر نکاح کر ڈالا۔

روہ کے ایک حکیم صاحب کے پڑوس میں ملتان کا ایک لڑکا شاکر اپنی ماں کے ہمراہ قیام پذیر ہوا۔ حکیم صاحب نے اپنی تربیت کے مطابق اس سے ملاقات کی اور پوچھا کہ ”بیٹے آپ احمدی ہیں“ جواب ملا ”نہیں“ حکیم صاحب نے فوراً اسے تبلیغ کرنے کا فیصلہ کیا اور ”مرزا غلام احمد“ کی نبوت ان کے خلفاء کے بارے میں جملہ کہانیاں سنا ڈالیں۔ شاکر اگرچہ مذہبی ذہنیت رکھنے والا مسلمان نہیں تھا، تاہم اسے

مرزائیت سے بھی کوئی رغبت نہیں تھی۔ حکیم صاحب نے اسے مسجد اور دیگر اجلاسوں میں آنے کی بہت پیشکش کی مگر وہ ہر بار طرح دے جاتا۔ ایک دن حکیم صاحب نے اسے گھر بلایا اور ڈرائنگ روم میں بٹھلایا۔ ابھی تبلیغ کا باب دوبارہ شروع ہوا ہی تھا کہ حکیم صاحب کی بیٹی چائے لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ بس پھر کیا تھا شاکر لڑکی کو دیکھتے ہی دم بخود ہو گیا ”اتنی حسین لڑکی شاید میں نے پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں“ خود کلامی کے انداز میں وہ بڑبڑایا۔ حکیم صاحب نے یہ صورت حل دیکھی تو کہنے لگے ”بیٹا! یہ میری بیٹی طاہرہ ہے اس سل فرسٹ ایئر میں داخل ہوئی ہے۔“ شاکر طاہرہ کے حسن قیامت خیز میں اس قدر کھویا کہ اس نے حکیم صاحب کی شبینہ روز تبلیغ کو گوارہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کہا ”حکیم صاحب! مجھے آپ کی باتیں بہت اچھی لگی ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ تمام باتیں مجھے رفتہ رفتہ بتائیں اور سمجھائیں۔“ حکیم صاحب تیار ہو گئے۔ یوں اس نے ایک مقررہ وقت پر ان کے گھر جانے کا معمول بنالیا۔ حکیم صاحب ایک نیا احمدی جماعت میں لانے میں مگن تھے جب کہ شاکر ترجمہ نگاہوں سے طاہرہ کو تسخیر کرنے میں مصروف تھا۔ حکیم صاحب کی مسلسل کوشش کے باوجود شاکر مرزائی تو نہ ہو سکا، مگر طاہرہ اس کے دام محبت میں آگئی۔ شاکر طاہرہ سے تعلق برقرار رکھنے اور حکیم صاحب کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ”نیم مرزائی“ ہو گیا۔ ان دونوں کی دوستی اور محبت کا حکیم صاحب کو بھی علم تھا مگر وہ شاکر کے مکمل مرزائی ہونے تک سب کچھ گوارا کرنے پر تیار تھے جبکہ شاکر انہیں ٹالنے کے لئے نت نئے بہانے بنا لیتا۔ کبھی کہتا میں اپنی تعلیم مکمل کر لوں، پھر مرزا ناصر کی بیعت کر لوں گا۔ فوری طور پر بیعت کرنے پر مجھے گھر والے عاق کر دیں گے۔ حکیم صاحب اس کی دلیلوں کو مانتے رہے اور اپنے گھر آنے جانے سے نہ روکا۔ اس دوران وہ اپنا مقصود بھی حاصل کرتا رہا۔ یوں اس نے پہلے ایف۔ اے پھر بی۔ اے کر لیا اور مرزائیت پر لعنت بھیجتا ہوا واپس ملتان چلا گیا جبکہ حکیم صاحب اور طاہرہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔

ایک لڑکی نور النساء ڈار کی داستان بھی مدتوں ربوہ کے کوچہ و بازار کا شاہکار بنی

رہی۔ جن دنوں نیا نیا ٹی وی آیا تو ربوہ کے متمول گھروں کی چھتوں پر بلند و بالا انتہینے لگے نظر آتے تھے۔ جماعت کی طرف سے بالا بلندیوں کو ٹی وی رکھنے کی سختی سے ہدایت تھی۔ ٹی وی پر جب ہفتہ وار فلم لگتی تو جماعت کے امراء، غریاء، ہم مذہبوں کو اجتماعی طور پر فلم دیکھنے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ یہ بات میرے ذاتی مشاہدے میں ہے کہ ہم نے بھی حوروں کے جلو میں بیٹھ کر پرانی فلم ”جھومر“ دیکھی تھی۔

غلہ منڈی بازار میں ایک جنرل سنور کا مالک عبدالسلط انتہائی وجیہ اور خوب روحوں تھا۔ کبڑی کے اس کھلاڑی کی ایک لڑکی بشری کے ساتھ گہری چھنتی تھی۔ ویسپا پر دونوں کھلے عام گھومتے۔ بشری اپنی سیلیوں کے جلو میں دکن پر شاپنگ کرنے آتی تو جو دل چاہتا، سمیٹ کر لے جاتی۔ اس دریا دلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد دکن خالی ہو گئی۔ تو بشری نے بھی اپنا رخ زیبا موڑ لیا۔ موصوف دن بھر کوئے جانوں کی خاک چھانتا لیکن وہ پری رو تو جیسے گم ہو گئی۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ بشری اس کے ساتھ فلرٹ کر رہی تھی۔ حالانکہ اس کا نکاح تو پہلے ہی کہیں ہو چکا تھا۔

مبارکہ بیگم محکمہ تعلیم کی ملازم تھی جس نے طلاق لینے کے بعد دوسری شادی نہ کی۔ حالانکہ کئی مرزائی رشتے اس کے ساتھ ”جڑنے“ کے لئے پر تول رہے تھے۔ لیکن اس نے کسی کو گھاس نہ ڈالی۔ اس کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ وہ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ حکام سے جو کام چاہے کروا لیتی ہے۔ مخالفین سے تبادلوں کے ذریعے انتقام لینا اس کا معمول تھا۔ ربوہ کے ”خاندان“ کے سرگردہ افراد ہوں یا مسلمان جاگیردار اس کی ”فکرم“ سب کے لئے یکساں تھی۔

غلمان

”سدومیت اور گے کلچر“ ربوہ کی آل نبوت اور امت کے تشخص کا لازمی جزو ہے۔ القابلیت اور الہامات کی رداؤں میں لپٹی ہوئی اس ”زریعت مبشرہ“ کا یہ کردار مرزا غلام احمد کے الہامات کی ساری حقیقت کھول کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے غایت تحریر میں مرزا طاہر کی احمدیہ نیٹ ورک ٹیلی ویژن پر کی گئی ایک تقریر کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے پاکستانی علماء کرام، خطیبوں اور مساجد کے اماموں پر اغوا، زیادتی، اغلام اور ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام لگائے ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں خود کو پاکیزہ اور پوتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات اس ”دروغ گو“ مرزا طاہر کے لئے جس کا حافظہ ختم ہو چکا ہے، ایک آئینہ ہے جسے دیکھ کر وہ اپنا سامنہ لے کر رہ جائے گا۔

یوں تو قصر خلافت ربوہ کے در و دیوار پر بنات امت کے ساتھ کیے جانے والے ”پاکیزہ“ اعمال کی کہانیاں ہی ربوہ کی آل نبوت کے کردار کا تجزیہ کرنے کے لئے کافی ہیں لیکن اس امت کے ”مسلک ہم جنس پرستی“ پر روشنی ڈالنی بھی ناگزیر ہے۔ تاکہ ان لوگوں کو پتہ چل جائے کہ سیٹلائٹ پر ”کف“ اور شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر سنگ و خشت برسانا آسان نہیں کہ وہ بھی اندرون خانہ کی پوری پوری خبر رکھتے ہیں۔

ہماری کلاس میں پڑھنے والے خانوادہ گن مرزائی نبوت کے تین سپوتوں، مرزا طیب، مرزا احسن اور سید قمر سلیمان کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ ہم لوگ نویں جماعت میں پڑھتے۔ کسی بات پر ان تینوں کی آپس میں لڑائی ہو گی۔ تیز گفتگو، دشنام طرازی سے ہوتی ہوئی کردار تک جا پہنچی۔ تینوں نے ایک دوسرے کے بچے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ خاندانوں، مائیکوں اور گھر کے ملازموں کے علاوہ کزنوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ایک دوسرے کی ”سدومیت داری“ کی داستانیں سنا دی گئیں۔ پوری کلاس

نسلیت دلچسپی سے جھوٹے نبی زادوں کے کردار کی حکایتیں سن رہی تھی۔ اسی دوران ماسٹر احمد علی کلاس میں تشریف لائے۔ انہیں دیکھ کر بھی شاہی خاندان کے ”امیلوں“ نے زبان کو لگام نہ دی اور باہمی کردار و اخلاق کی دھجیاں بکھیرتے رہے۔ ماسٹر احمد علی بھی سدوی صفات سے ملامل تھے اور ”اپنی امت“ کی اس روایت پر پوری طرح عمل پیرا رہتے تھے۔ تاہم ”مرزوں“ کو بھری کلاس کے سامنے ایک دوسرے کی پگڑی اچھالتے دیکھا تو کہنے لگے:

”دیکھو صاحب زادو! اگر نبیوں کی اولادیں ہی آپس میں اس طرح تھوکا نفرتی کرنا شروع کر دیں گی تو امت کے ان طلباء کا کیا بنے گا“ جنہوں نے اپنے کردار کو آپ لوگوں کے طرز عمل کی مثال سے سنوارنا ہے۔“

نبی زادے لڑتے رہے۔ ماسٹر احمد علی انہیں خاموش کرانے میں جب ناکام ہو گئے تو معاملہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے نہ جانے کس طرح تینوں کو ”کول ڈاؤن“ کیا۔ لیکن اس دوران ان کی لڑائی سے قصر خلافت کے شنزادوں کی اصلیت اور ان کی ”کردار کہانی“ کھل کر سامنے آگئی۔ کلاس کے ایک طالب علم ظفر باجوہ نے اس صورت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہانی زادوں نے مائیکوں اور خانساموں کا تو زور و شور سے ذکر کیا لیکن میرے سمیت سکول کے بہت سے ساتھیوں کا تذکرہ کرنا ہی بھول گئے جن کا ان شنزادوں کی خدمت میں برابر کا حصہ ہے۔

فیکٹری ایریا محلہ میں ہمارا ایک کلاس^{۱۱} فیلو اعجاز اکبر رہا کرتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھے اپنے محلے کی دو انتہائی سرکردہ اور مذہبی اکابر شخصیات کا تذکرہ سناتے ہوئے کہا کہ مولانا غلام باری سیف اور قانون دان سعید عالمگیر کی آپس میں گہری چھنتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے دونوں اپنے ذوق طبع کی تسکین کے لئے ایک دوسرے کے بیٹوں کو تختہ مشق بناتے ہیں۔ شہر کے در و دیوار ”نونا لان جماعت“ کے باہمی اختلاط کے قصوں سے سیر رہتے تھے۔ ”مگوتے ابرار والی“ نظم تو مدتوں نوشتہ دیوار بنی رہی تھی جو دو نہالوں

کی سیاہ کاری کی ترجمان تھی۔

جسم فروشی کا رجحان اس قدر زیادہ تھا کہ ہر خوش شکل لڑکا ایک چٹا پھرتا ”بروتھل“ تھا۔ ایسے طلباء جن کے والدین اپنی قلیل آمدنی سے جماعت کا ”دورخ“ بھرتے اور اپنی اولاد کی ادنیٰ سی خواہش بھی پوری نہیں کر پاتے تھے، ان کے بچوں کے لئے پیسہ کمانے کے لئے یہ آسان ترین راستہ تھا۔ بے شمار لڑکے کھلے عام ”معاملہ“ طے کرتے اور چل پڑتے تھے۔ والدین اور اساتذہ کی اکثریت اپنے بچوں اور طلبہ کی ان ”مصروفیات“ سے آگاہ تھی۔ تعلیمی اداروں میں تمام اساتذہ نے اپنے ارد گرد ”خبرو“ طلبہ کی منڈلی بنا رکھی ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کے گروپ سے ”لڑکا“ توڑنا ایک معرکہ سمجھا جاتا تھا۔ اس قبیح عمل کی بجا آوری کو یہ لوگ اپنے آباء کی سنت اور اتباع خیال کرتے تھے۔

گول بازار کے ایک بہت بڑے دکاندار کا بیٹا شبیر شاہ بھی ہمارا کلاس فیلو تھا۔ وہ بھی اپنے نبی کی تعلیمات پر پوری طرح عمل پیرا رہتا تھا۔ لیکن اس بے چارے کے ساتھ عجیب قسم کا ”دھرو“ ہو گیا جس کی صفائیاں دیتے ہوئے اس کی زبان تھک گئی مگر رسوائی کی داستان پھر بھی ہر کوچے میں جا پہنچی۔ قصہ یہ تھا کہ شبیر شاہ ایک شخص کے ساتھ طے شدہ پروگرام کی خلاف ورزی کر کے کسی اور کے ہاں جا پہنچا۔ اول الذکر نے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے ایک منصوبے کے تحت ”خصوصی لمحات“ کی تصاویر بنا کر سکول میں تقسیم کر دیں۔

تصاویر کے ذریعے بلیک میلنگ کی دھمکی عام تھی۔ اکثر شہری اس سے کام نکل لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تیزاب سے چہرہ داغ دینے کی دھمکی بھی کام کر جاتی تھی۔ ”مساجد“ ”جائے نماز“ کے علاوہ جائے عمل بھی تھیں۔ مرزا ناصر کا زمانہ گزر چکا تھا مگر مرزا طاہر کے بے شمار ہم جولی ”مرزا تاری“ کے ساتھ گزارے ہوئے ”شب و روز“ پر نازاں ہوا کرتے تھے۔ مرزا لقمان کی ”صحبت“ سے فیض یاب ہونے والے بھی خود کو امت کے برہمن خیال کیا کرتے تھے۔ علی ہذا القیاس ربوہ ”شہر سدوم“ جہاں بنے والوں

کا مذہب سدومیت ہے جسے ہر کس و ناکس نے اپنے دائرہ کار میں اختیار کر رکھا تھا۔ مولوی محمد ابراہیم بھانڈوی ہمارے سکول کے استاد اور بورڈنگ ہاؤس کے وارڈن تھے۔ ان کی ”نگاہ لطف و کرم“ ہر لڑکے پر یکساں ہوتی۔ تاہم لڑکوں سے وصول کیے ہوئے جسمانی خراج کا حساب ان کے بیٹے انور بھانڈوی کو چکانا پڑتا تھا۔ مولوی صاحب اپنی افتاد طبع سے اس قدر مجبور تھے کہ بعض اوقات ان سے کئی حرکات کھلے عام ہی میں سرزد ہو جایا کرتی تھیں جن سے انہیں شرمندگی اٹھانے کے علاوہ سکول انتظامیہ کی طرف سے محتاط رویہ اختیار کرنے کا نوٹس آ جایا کرتا تھا۔

تعلیم الاسلام کالج میں دو لڑکوں امین الدین اور طیب عارف کے حسن کے اس قدر چرچے تھے کہ ہر شخص ان سے بات کر کے اور ہاتھ ملا کے اپنے نصیب پر ناز کیا کرتا تھا۔ امین الدین کے فرسٹ ایئر میں داخلے کے بعد تمام اساتذہ کے دل چل رہے تھے کہ کاش انہیں اس کی کلاس مل جائے۔ یہ لڑکا جب سامنے سے گزرتا تھا تو لڑکے با جماعت یہ گیت گایا کرتے تھے۔ ”تک چن پیا جاندا ای“ طیب عارف کے رخسار کے تل پر تو یار لوگ شاعرانہ ماحول بنا لیتے۔ ہر شخص بساط بر اشعار اس ”تل“ کی نذر کر دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ”امرد“ ایسے تھے جن کے حسن کے قصیدے ربوہ کی ”گے“ سوسائٹیوں میں پڑھے جاتے تھے۔ یہ تو چیدہ چیدہ لوگوں کے قصے ہیں ورنہ یہاں کا ہر فرد سدومیت کو اختیار کر کے فخر محسوس کرتا ہے۔ اگر فردا“ فردا“ داستانیں لکھی جائیں تو کئی دفتر تصنیف ہو جائیں۔

تعلیم الاسلام کالج کے ایک پرنسپل چودھری محمد علی بھی اس کھیل کے مرد میدان تھے۔ فضل عمر ہوشل کی وارڈن شپ کے دوران ان کی ”داستان سدومیت“ ہوشل اور وارڈن خانے کے در و دیوار پر رقم رہی۔ پرنسپل بننے کے بعد وہ مرزا ناصر احمد والی بڑی کونٹھی کے مکین بنے تو وہاں انہوں نے مرزا ناصر احمد اور ان کے کارناموں کو زندہ رکھا۔ بعض اوقات انتہائی دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی جب پرنسپل کے ساتھ ساتھ جانے والے کسی بھی ”خوش رو“ لڑکے کو اس کے ساتھی دیکھ لیتے، بعد میں

”یاروں“ میں بیٹھ کر اسے وضاحتیں کرنا پڑ جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ جو لڑکا چودھری صاحب کے گھر سے آتا ہوا نظر آ جاتا، اس پر توہمتوں ”الگلیاں“ اٹھتی رہتی تھیں۔ ان سب باتوں کے باوجود پرنسپل کا بلانا اور پری جملوں کا ان کے گھر بلا تامل چلے جانا کسی دور میں بند نہ ہوا۔

ربوہ کے ملاں و پیر اور میر و وزیر ہر قسم کی اخلاقی مذہبی اور سماجی قید سے آزاد ہیں۔ وہ خوش وقت ہونے کے لئے صنف موافق و مخالف کی تفریق نہیں کرتے۔ دونوں اجناس ان کے ہاں ارزاں اور وافر ہیں۔

نام نہاد صحابیوں کی افراط

قدرت اللہ شہاب نے اپنی تصنیف ”شہاب نامہ“ میں ایوب چوک جھنگ کے ایک موچی کی عظمت کا ذکر کیا ہے۔ جس کی خودداری کو سابق صدر ایوب خان نے بھی خراج تحسین پیش کیا تھا۔ ربوہ کے رحمت بازار میں دلی محمد کی آٹا پیسنے والی چکی کے پاس ایک سلیم موچی کا ”تھرا“ تھا۔ یہ شخص نہایت سچا، کھرا، دیاندار اور بااخلاق تھا۔ میں نے گزشتہ اوراق میں کئی ایک مرزائیوں کا ذکر کیا ہے، جو مرزائیت کے بد نما وجود میں نہ صرف اجلے اور علیحدہ نظر آتے تھے بلکہ انہیں مرزائی کہتے ہوئے بھی دل دکھتا ہے۔ میرا بہت دل چاہتا تھا کہ کاش یہ لوگ مرزائی نہ ہوتے۔ سلیم موچی کا شمار بھی انہیں لوگوں میں ہوتا تھا۔ سلیم ابا جی کی بہت عزت کرتا تھا۔ ہم لوگ اسے اکثر کہا کرتے تھے:

”سلیم! تم شکل و عادت سے مرزائی نہیں لگتے۔ پھر تم ان بد بختوں میں کہاں آ پھنسے ہو۔“

ہمیشہ کی طرح سلیم مسکرا دیتا اور کہتا ”دیکھیں جی ماں باپ احمدی تھے۔ میں بھی احمدی بن گیا۔ وہ کچھ اور ہوتے تو کچھ اور بن جاتا۔“

سلیم کو کئی بار ابا جی نے مسلمان ہونے کی پیشکش کی لیکن وہ انکار کیے بغیر خاموش ہو جایا کرتا تھا۔ ایک روز میں سلیم کی دکان پر کھڑا تھا کہ وہاں ایک بہت ہی بوڑھا سا شخص آ کر بیٹھ گیا۔ اس شخص کی زبان کپکپا رہی تھی اور ہاتھوں میں ریشہ طاری تھا۔ اتنے میں اور لوگ بھی اس بوڑھے کے پاس آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سلیم کی دکان کو لوگوں کے ایک گول دائرے نے گھیر لیا۔ ہر شخص بوڑھے کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اصرار کر رہا تھا:

”باباجی کچھ باتیں سنائیں اپنے زمانے کی۔“

کانپتی آواز میں بابے نے کہا ”ٹھہر جاؤ اوئے منڈیو! مینوں ساہ تے لین دے او۔“ قدرے تال کے بعد بابے نے ”مرزا غلام احمد“ کے بارے میں مختلف قصے اور قادیان کی کہانیاں سنائی شروع کر دیں۔ اسی دوران اس نے سیلاب کے دنوں کا ایک لطیفہ بھی سنا ڈالا۔ لطیفہ انتہائی غلیظ تھا۔ مجھے اتنے بزرگ بندے کے منہ سے ایسا لطیفہ سن کر بڑی مایوسی ہوئی۔ مگر تمام سامعین اس لطیفے پر قہقہے لگا رہے تھے اور کہہ رہے تھے ”باباجی اک ہور سٹو۔“

بابا اپنے ”نمی“ کے تذکرے کو غلیظ لطیفوں کے ساتھ کس کر کے کوئی گھنہ بھر اپنے ماننے والوں کو محفوظ کرتا رہا۔ اس دوران اس کے لئے دودھ کا ایک بھرا ہوا پیالہ لایا گیا جو اس نے پیا اور کہا ”ہٹو اوئے منڈیو! ہن مینوں جان دیو۔“

بابا چلا گیا۔ میں نے سلیم سے پوچھا یہ بابا کون تھا؟ سلیم حسب معمول مسکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ایک اور شخص مجھے سرزنش کے انداز میں کہنے لگا ”اسے بابا مت کہو، بلکہ باباجی کہو، یہ تو ہمارے حضرت مسیح موعود کے صحابی ہیں۔ انہیں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ یہ تو کبھی موج میں آجائیں تو بات کرتے ورنہ تو لوگ ان کی باتیں سننے کو ترستے ہیں۔“

”صحابی“ میں نے ذرا لمبا کر کے کہا، اور سٹپٹا کر رہ گیا۔ لیکن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے سلیم سے کہا ”صحابی کا درجہ تو وہ ہوتا ہے جو حضرت ابو بکر صدیق ؓ اور حضرت عمر فاروق ؓ کو حاصل تھا۔ جن کی زندگی کا لمحہ لمحہ، ان کی گفتگو کا حرف حرف ایک درس اور مشعل راہ تھا۔ یہ کیسا صحابی ہے جس نے اتنے بیہودہ لطائف سنا ڈالے اور لوگ واہ واہ کر رہے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ مذکورہ شخص کے ساتھ میری توٹکار ہو جاتی، سلیم نے نہایت معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات کو سنبھال لیا اور جب وہ شخص چلا گیا تو سلیم کہنے لگا ”بھیا! تم خواہ مخواہ ان پھنڈوں میں نہ پڑا کرو، ہر شخص کی عقیدت کا اپنا معیار ہوتا ہے انہیں یہی پسند ہے پھر لڑنا کیسا۔“

میں بھی یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ جس نبی کا یہ صحابی ہے، وہ ”نبی آخر کیا ہو گا“ کیونکہ مرزا غلام احمد کے مختصر سے مختصر کلام میں بھی زیادہ سے زیادہ دشنام شامل رہی ہیں۔ چنانچہ اس کے مصاحب جیسے پڑھے ہیں، ویسے ہی پڑھائیں گے۔

مجھے ذاتی طور پر بھی مرزائیوں کے ایک نیم صحابی سے ملاقات کا پالا پڑا۔ یہ شخص بھی کوئی ۸۰ کے پٹے میں تھا۔ اس کی زبان کترنی کی طرح چلتی تھی۔ اس کے ہر موضوع کی تن آکر ”سیکس“ پر ٹوٹا کرتی تھی۔ اس کے پاس کوئی بھی شخص آکر بیٹھتا، یہ اس سے جنسی موضوعات پر بات چیت کر کے خوش وقت ہوتا۔ ایک دن کہنے لگا میں اگرچہ عمر کے اس حصے میں ہوں جب انسان ”خصی بیل“ جیسے حل میں ہوتا ہے لیکن میرے اندر زندگی کے تمام تر ”کرنٹ“ موجود ہیں۔ اب بھی میں بس، ریل یا تانگے میں بیٹھوں تو عورتیں بالخصوص نو عمر لڑکیاں مجھے بوڑھا آدمی سمجھ کر ساتھ بٹھالیتی ہیں۔ ان کے خیال میں، میں بے ضرر سا بوڑھا ہوں حالانکہ صورت حل اس کے برعکس ہوتی ہے۔ میرا تو رواں رواں اس وقت عمر رفتہ کو صدائیں دے رہا ہوتا ہے اور مجھے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے جو میری عمر کا اقتضا نہیں ہے۔

روہ میں مجھے ”مرزا غلام احمد“ کے ایک اور صحابی کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ سل خوردہ شخص اپنی عمر کی سنخری بنانے والا تھا۔ سرخ سر اور داڑھی والا سیاہ رو بابا ”آرے آرے تیرے گھرتے مینارے“ کہلاتا تھا۔ اسے سوہنی، موہنی اور کول سی لڑکی سے شادی کا بے حد شوق تھا۔ ایک روز میں سکول سے واپس آ رہا تھا تو اپنی گلی کی نگر پر بڑے چھوٹے لوگوں کا ایک مجمع دیکھا جس میں سفید شلوار قمیص اور شیلے دار پگڑی والا ایک پستہ قد بوڑھا کھڑا دعا مانگ رہا تھا جب کہ سب لوگ اونچی آواز میں آمین کہتے جا رہے تھے۔

دعا کا خلاصہ یہ تھا۔

”اے اللہ مجھے اتنی دولت دے کہ میں اس کے ڈھیر کے نیچے دب جاؤں۔ مجھ سے نکلا نہ جائے۔ لوگ آکر مجھے نکالیں۔ پھر

لیکن کبھی کبھی جب آتا تو لوگ اسے بھی ”نیم صحابی“ کہا کرتے تھے۔ مرزا غلام احمد کا یہ صحابی جب بھی آتا اپنے کرایہ داروں کو انتہائی غلیظ گالیاں دیتا اور مکان خالی کرنے کے لئے کہا کرتا تھا۔ ایک بار تو اس نے اندھیر ہی مچا دیا۔ اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لایا اور چاچا محمد حسین کے گھر والوں کو مکان خالی کرنے کو کہا۔ انہوں نے منت سماجت کر کے مہلت جو مانگی بس پھر کیا تھا۔ بابا بھگیا اور گالیوں کی بھرمار کر دی۔ اپنا لٹھ نما ڈنڈا در و دیوار پر برسائے لگا۔ کمانڈر کی طرف سے فائر کرنے کا حکم ملنے کی دیر تھی، اس کے ساتھ آئے ہوئے حواریوں نے بیچارے محمد حسین کے گھر کا سامان باہر پھینک دیا۔ یہ لوگ رات بھر گلی میں رہے اور اگلے دن نہ جانے کیسے سر چھپانے کے لئے کوئی کوشش تلاش کی۔ ”بوڑھے بل جل صحابی“ نے مکان گروا کر اس کی جگہ نیا مکان تعمیر کروایا۔ اس میں زیادہ کرایہ دینے والے کرایہ دار رکھ لئے۔ یہ تھا ”مرزا غلام احمد“ کے صحابیوں کا کردار۔ حالانکہ صحابی تو اچھی صحبت کے باعث لوگوں پر مہربان ہوتے ہیں اور خود دکھ اٹھا کر غلطی خدا کو سکھ پہنچاتے ہیں۔

ربوہ میں ہر دوسرا تیسرا ضعیف و نحیف بوڑھا خود کو صحابی یا نیم صحابی کہلا کر اتراتا پھرتا تھا۔ ہمارے سکول کے ایک لڑکے کا دادا بہت بوڑھا تھا۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت تاہم یہ بابا ہر کسی کو گالیاں خوب دیا کرتا تھا۔ اس کی دشنام طرازی سے بچنے کے لئے بابے کی آل اولاد نے اسے ایک کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ ایک دن دروازہ کھلا رہ گیا اور بابا کسی طرح گھر سے باہر نکل آیا اور گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھ کر ہر آنے جانے والے کے شجرہ نسب پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ بابے کے گھر والوں نے اسے گھر کے اندر لے جانے کی کوشش کی تو اس نے انہیں اینٹیں مارنی شروع کر دیں۔ آخر کار شام کو بابا تھک ہار کر گھر کے اندر چلا گیا تو اس کے گھر والوں نے اسے کمرے میں بند کر کے ”لاک“ لگا دیا۔ لوگوں نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ یہ بابا جی کون تھے تو جواب دیا گیا یہ ہمارے بابا جی اور حضرت مسیح موعود کے صحابی ہیں۔

میرے کئی کلاس فیلو بہت کٹر مرزائی ہونے کے باوجود ”مرزا غلام احمد“ اور اس

کی ذریت کے بارے میں میرے خیالات کو درست تسلیم کرتے تھے۔ میں نے اپنے ایک ہم جماعت سے پوچھا ”یار! یہ صحابی کا کیا چکر ہے۔ تمہارے شہر میں ہر گھر سے کوئی نہ کوئی صحابی نکل آتا ہے۔“ موصوف نے کہا ”یار تم ان چکروں میں نہ پڑا کرو کون کیا ہے؟ یہ صرف اللہ جانتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص خود کو صحابی کہہ کر دل پشوری کر لیتا ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے یہاں تو ایک اینٹ اٹھاؤ، اندر سے صحابیوں کے ”اجڑ“ نکل آئیں گے۔ کیونکہ ربوہ میں یہ فیشن ہے کہ ہر شخص ”خاندان نبوت“ سے قرابت داری ظاہر کرنے کے لئے اپنے باپ دادا کو صحابی یا نیم صحابی کا درجہ دے ڈالتا ہے۔“

گھونگٹ کی ہوا

مرزا محمود احمد نے دنیا سے کوچ کیا تو مرزا ناصر احمد تعلیم الاسلام کالج کی پرنسپل شپ چھوڑ کر عازم قصر خلافت ہوئے۔ مرزا رفیع احمد اور مرزا ناصر احمد کے درمیان خلافت کا بیج پڑا۔ دونوں کے ووٹ برابر تھے مگر دھاندلی سے ”فرشتوں“ کے ووٹوں نے مرزا ناصر احمد کا مینڈیٹ بھاری کر دیا اور یوں کالج کی پرنسپل ”اپنی امت“ کا خلیفہ بن گیا۔

۱۹۶۵ء خدا حافظ ہونے کو پر تول رہا تھا جب میں نے پہلی بار مرزا ناصر احمد کو دیکھا۔ خلیفہ بننے کے بعد انہیں ہمارے سکول میں مدعو کیا گیا۔ سکول کے بشیر ہال میں ان کا خطاب ہوا۔ خطاب کیا تھا، میں نے کچھ ہی نہ دھرا دراصل مجھے مرزائیوں کی تقاریر اور ان کے خانوادہ نبوت کے برز جمہوں کی تصویر سے کوئی رغبت نہیں۔ ان کے خطاب اتنے بور ہوتے ہیں نہ جانے یہ بد ذوق اہل جماعت کیسے سنتے اور برداشت کرتے ہیں۔ ان کی تقاریر عیسائیوں سے محبت، منافرت، یہودیوں کی کلمہ لیس، انگریزوں اور ہندوستانیوں کے قصائد اور ڈاکٹر ڈوئی کے نام نہاد فسانوں کا ملغوبہ ہوتی تھیں۔ میں نے مرزائیوں کی کوئی کتاب سرورق کے علاوہ نہیں پڑھی کیونکہ یہ سب خرافات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ میرا فلسفہ یہ ہے کہ جو حقیقت دلیل کی محتاج ہو، وہ آدمی حقیقت ہوتی ہے۔ مرزائیوں کے بارے میں یہ نکتہ نظر ہی کافی ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ لہذا یہ جاننے کے لئے ان کی کتابیں پڑھنا یا ان کے علماء کے واعظ سنا کہ شاید مرزائی سچے نہ ہوں پرلے درجے کی احمقانہ حرکت ہے۔ میں انہیں شروع دن سے جھوٹا سمجھتا ہوں اور یہی میرے دل کی آواز ہے۔ لہذا ان کی تقریر و تحریر سے مجھے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔

ہاں تو مرزا ناصر احمد سے ملاقات کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ ہوا یوں مرزا ناصر کے خطاب کے بعد ہر لڑکا باری باری بیچ پر جا کر ان سے مصافحہ کر رہا تھا۔ جب میری باری آئی تو میں

نے حسب عادت ”نصف ہاتھ“ ملایا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نصف ہاتھ ملانا بچپن سے میری لاشعوری عادت ہے۔ اکثر لوگ اسے تکبر بھی کہتے رہے ہیں حالانکہ ایسا نہیں۔ ”میں کیا ہوں یہ میں جانتا ہوں اس لئے تکبر کیوں کروں۔“ اس غلطی پر مجھے اپنے گھروالوں سے بے شمار دفعہ ڈانٹ پڑ چکی ہے۔ اس کے باوجود لاشعوری طور پر یہ حرکت اب بھی کبھی کبھار مجھ سے سرزد ہو جاتی ہے۔

چنانچہ جب میں نے مرزا ناصر سے آدھا ہاتھ ملایا تو اس موقع پر موجود ہمارے ہیڈ ماسٹر میاں محمد ابراہیم نے مرزا ناصر سے کہا ”حضور!“ آپ اس لڑکے کو جانتے ہیں یہ زراعت والے صوفی فضل کریم صاحب کا صاحبزادہ ہے۔ اس پر مرزا ناصر احمد نے مجھے کندھے سے پکڑ کر دوبارہ اپنی طرف موڑا اور کہا ”بھئی آپ کے ابا تو بڑے پہلوان قسم کے انسان ہیں مگر آپ نے انتہائی بے جان انداز میں ہاتھ ملایا ہے۔ لاؤ پھر سے ہاتھ ملاؤ۔“ اس پر انہوں نے میرا پورا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تین مرتبہ زور سے ہلایا۔

ہیڈ ماسٹر ابراہیم اور دیگر اساتذہ جو میری قادیانیت سے بے اعتنائی سے خاصہ واقف تھے، مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھ اور سوچ رہے تھے کہ شاید مرزا ناصر احمد کی یہ شفقت مجھ پر اثر انداز ہو جائے گی۔ بعد میں میرے ہم جولیوں نے کئی بار مجھے کہا ”دیکھو ہمارے حضرت صاحب نے تمہیں کتنا وقت دیا اور تمہارے ساتھ شفقت فرمائی۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا؟“ میں نے اپنا مخصوص جواب دے کر ان کے ارمانوں پر اوس ڈال دی اور کہا ”بھئی اس میں متاثر ہونے والی کون سی بات ہے۔ مرزا ناصر احمد میرے ابا جی کے ”یار“ ہیں لہذا انہوں نے مجھے تم لوگوں سے زیادہ لفٹ کرا دی۔“

میں ۱۹۶۶ء میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ سردیوں کے موسم میں میرے چہرے کی جلد خشک اور سخت ہو کر پھٹ جایا کرتی۔ بعض اوقات تو اس سے خون بھی رسنے لگتا تھا۔ ایک روز ابا جی مجھے چپک کرانے کے لئے فضل عمر ہسپتال لے جا رہے

تھے۔ ہم شیشن کی دوسری طرف دارالضیافت والی بنگلی سڑک پار کر کے گول بازار جا رہے تھے کہ قصر خلافت اور امور عامہ کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر گاڑیوں کا ایک کارواں نمودار ہوا۔ واضح رہے مرزا ناصر احمد نے جب کہیں جانا ہوتا تھا تو قاعدے کے مطابق ان کا قافلہ تین موٹر سائیکلوں اور پانچ گاڑیوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ ایک موٹر سائیکل آگے ہوڑ بجاتی جبکہ اس کے پیچھے دو موٹر سائیکلیں ہوتی تھیں۔ اس کے بعد ایک جیپ پھر کار درمیان میں نیلے رنگ کی شیورلیٹ کار جس میں پردے آویزاں ہوتے تھے۔ اس میں مرزا ناصر احمد اور ان کی اہلیہ منصورہ ہوتے جب کہ اس کے پیچھے دو محافظوں کی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ عبدالمنان صوبیدار اور حوالدار صالح محمد مرزا ناصر کے چیف سیکورٹی آفیسر ہوا کرتے تھے۔

ہم اس سڑک کے کنارے کنارے رواں تھے کہ مرزا ناصر احمد کا کارواں ہمارے پاس سے گزرا۔ نہ جانے کیسے، کب اور کیوں مرزا ناصر احمد نے گاڑی کا پردہ اٹھایا۔ بے ساختہ ان کی نظر ابا جی پر پڑی اور مرزا ناصر احمد نے گاڑیاں روک دینے کا حکم دیا۔ گاڑیاں رک گئیں۔ مرزا ناصر احمد نے ابا جی سے استفسار کیا ”صوفی صاحب! کمال جا رہے ہیں؟“

”بچے کو ہسپتال چیک کرانے کے لئے جا رہا ہوں۔“ ابا جی نے

جواب دیا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ مرزا ناصر نے پوچھا۔

میرا چہرہ دکھاتے ہوئے ابا جی نے ساری کہانی کہہ ڈالی۔ مرزا ناصر احمد نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ میں نے پاؤں میں ہوائی چپل پہن رکھی تھی۔ ان دنوں اس چپل کا عام رواج تھا۔ مرزا ناصر احمد نے مجھے کہا ”بیٹا! ہوائی چپل پہننا چھوڑ دو، چہرہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ڈرائیور سے کوئی دوا طلب کی۔ اور پھر ہومیو پیتھک کی گولیوں سے بھری ہوئی ایک نیلی شیشی مجھے دے دی اور کہا کہ اب ہسپتال

جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت مرزا ناصر احمد کی بیوی منصورہ بھی حسب معمول ساتھ تھی۔

ربوہ کی تاریخ میں خلیفہ کی سواری کا کسی عام اور خاص طور پر غیر احمدی کے لئے رک جانا اپنی نوعیت کا واحد واقعہ تھا۔ اس وقت سڑک پر اور لوگ بھی تھے جو ہمارے مقدر پر رشک کر رہے تھے جب کہ ہم ان کی احمقانہ سوچ پر ماتم کر رہے تھے۔ اس بات کی ربوہ شہر میں دھوم مچ گئی۔ کیونکہ اہل ربوہ کے لئے یہ انوکھی بات تھی۔ وہ لوگ جو ”خلیفہ صاحب“ سے ملاقات کے لئے ہفتوں پہلے درخواست دیتے ہیں، پھر دنوں تک انہیں ملاقات کے لئے ہاری کا انتظار رہتا ہے، اس واقعہ پر حیران بھی تھے اور تملنا بھی رہے تھے کہ آخر ”ہمارے حضور“ ایک غیر مرزائی شخص پر اس قدر کیوں مہربان ہیں۔ جو ان عنایات خسروانہ کو خاطر میں لاتا ہے نہ جماعت میں داخل ہوتا ہے۔

سڑک پر کھڑے لوگوں نے ابا جی سے کہا ”آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ اللہ نے آپ پر بڑا کرم کر دیا ہے۔ اب آپ کو بھی چاہئے کہ ”احمدی جماعت میں شمولیت کر لیں۔“ ابا جی نے جواباً کہا میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ اللہ پاک نے مجھے حضرت محمد و احمد علیہ السلام کا امتی بنایا ہے لیکن مجھے کیا پڑی ہے کہ میں ان چھوٹے چھوٹے واقعات سے متاثر ہو کر اپنا دین چھوڑ دوں۔ کہنے والوں، جن کی ہمارے مرزائی ہونے کے لئے رال ٹھک رہی تھی، کے منہ لٹک رہے تھے۔

ایک بار ایک شخص نے جو مرزائی سنڈیکیٹ کا سرکردہ رکن تھا، ابا جی کو بتایا کہ مرزا ناصر سے کسی شخص نے شکایت کی کہ آپ کی صوفی فضل کریم پر بے پناہ عنایات ہیں لیکن وہ کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ آپ کسی طرح انہیں مرزائی کریں یا پھر ان کے ساتھ مروت آمیز سلوک ترک کر دیں۔ مرزا ناصر نے اسے جواب دیا ”تم لوگوں کو صوفی صاحب کے مقام کا علم نہیں۔ ایسے بلند مرتبت لوگ مدتوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے اوصاف ہر عامی نہیں سمجھ سکتا۔ ان کو سمجھنے کے لئے دیدہ بینا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے مقام کے مطابق ان کی عزت کرتا ہوں۔“

میرے دادا جن میاں محمد بخش کا ۱۹۶۸ء میں انتقال ہوا تو مرزا ناصر احمد نے ابا جی کو خصوصی طور پر اپنے ہاتھ سے تعزیتی خط لکھا حالانکہ عام طور پر خلیفہ کی طرف سے جماعت کے لئے طبع شدہ تنیتی اور تعزیتی خطوط ارسال کئے جاتے ہیں جن پر صرف پین سے مکتوب الیہ کا نام اور پتہ لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ خطوط ہمارے لئے کسی اہمیت کے حامل نہیں تھے لہذا ہم نے سنبھل کر نہیں رکھے تھے۔ مرزا ناصر احمد، مرزا غلام احمد کا پوتا تھا جس نے قصر رسالت اور کاشانہ نبوت میں نقب لگائی لیکن یہ شخص ابا جی کو باقاعدہ خطوط تحریر کرتا جن میں دعا کی درخواست کی جاتی تھی۔ حالانکہ مرزائی دنیا کے باقی مرزا ناصر احمد سے دعا کی التجا کیا کرتے تھے۔

ایک بار ابا جی سے چند لوگوں نے کہا کہ مرزائی خلیفہ بلکہ ”خاندان نبوت“ کے دیگر چشم و چراغ آپ کا پیروں کی طرح احترام کرتے ہیں۔ آپ انہیں دعوت تبلیغ کیوں نہیں دیتے اور ان کے راہ راست پر آنے کے لئے دعائیں نہیں کرتے۔ اس پر ابا جی نے کہا ”ہدایت صرف اللہ کی طرف سے ہے مگر جن کے دلوں پر مر لگا دی گئی ہو وہ کیسے ہدایت پاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا ناصر مرزائی سلطنت کا بادشاہ ہے۔ اپنا تخت و تاج اسے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ چنانچہ کسی حکمران کو حکومت چھوڑنے کے لئے کہا جائے تو وہ کبھی بھی نہیں مانے گا۔ یہی حال ان کا ہے۔ لہذا راندہ درگاہ لوگوں کو رلو پر لانے کے لئے کوشش کرنا فضول عمل ہے۔

ہمارے پڑوس میں مستری فضل دین آف سائبیریا کا گھر تھا۔ اس کا بیٹا اور لیس احمد بشیر بھی ابا جی کا بہت معتقد تھا۔ ہر کام کرنے سے پہلے ان سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ لوہوں کے بھانجے ہاپوں سلیم کی سالگرہ تھی۔ جس میں مرزا ناصر کو بطور مہمان خصوصی بلایا گیا تھا جب کہ ہم بھی تقریب میں مدعو تھے۔ میں اور میرے ابا جی تقریب میں شرکت کے لئے گھر سے نکل رہے تھے۔ عین اس وقت مرزا ناصر کی سواری طرے دروازے کے سامنے رکی۔ مرزا ناصر کی نگاہ ہم پر پڑی تو کہا:

”خدا صوفی صاحب! آپ یہاں رہتے ہیں؟“

”جی یہی میرا غریب خانہ ہے“ ابا جی نے کہا۔
 ”تو پھر پہلے آپ کے دولت خانے پر حاضر ہونا چاہئے“ مرزا ناصر
 نے کہا۔

”ضرور ضرور“ ابا جی نے کہا اور بیٹھک کھلوائی۔

دو کرسیوں اور ایک چارپائی پر مشتمل ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ”سکینین“
 نوش کی گئی اور پھر ہمارے ساتھ ہی ادیس کے گھر روانہ ہوئے۔ اس واقعہ پر بہت
 سے مرزائی جل بھن کر رہ گئے۔ کئی ایک نے ابا جی سے کہا ”دیکھیں نور کی برسات
 چل کر آپ کے گھر آگئی ہے مگر آپ کو نہ جانے کیوں کوئی اثر نہیں ہوتا۔“

ابا جی نے کہا ”اتھو! سوچو تو ذرا‘ تمہاری نام نہاد نور کی برسات جس شخص
 کے گھر چل کر آئی ہے‘ اس کو بھی تو اللہ تعالیٰ نے کسی صلاحیت سے نوازا ہو گا جس کی
 بنا پر یہ سب کچھ ہوا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ ایسی برسات آئے یا جائے پتھر کو کبھی
 چونک نہیں لگ سکتی۔“

ابا جی کا قاعدہ تھا کہ وہ کسی کے ذاتی کام پر توجہ دینے کے بجائے امور سرکار
 باقاعدگی اور بروقت انجام دینے کی پالیسی پر کاربند رہتے تھے۔ ان کے دور میں ربوہ کے
 نواحی علاقوں میں فصلوں کی پیداوار دوگنا ہو گئی۔ ربوہ جیسی کلر والی زمین جہاں پانی بھی
 کھاری تھا‘ وہاں اعلیٰ نسل کے پھل اور پھول دار پودوں نے نشوونما پائی ورنہ وہاں
 صرف جنگلی کیکر کے سوا کچھ آگتا ہی نہیں تھا۔ آپ اپنے حلقے میں ہر شخص کی زمینوں
 پر جایا کرتے تھے۔ فصلوں‘ پودوں اور زمین کا معائنہ کرتے‘ کاشتکاروں اور زمینداروں کو
 مشورے دیتے اور زمین زرخیز بنانے کے زرعی طریقے بتاتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک
 روز وہ مرزا ناصر احمد سے محکمہ ملاقات کرنے کے لئے قصر خلافت گئے۔ میں بھی ان
 کے ہمراہ تھا۔ مرزا ناصر کے پرائیویٹ سیکرٹری ظہور باجوہ نے ابا جی سے کہا ”آج ملاقات
 کا دن ہے نہ آپ کی طرف سے ملاقات کی کوئی درخواست آئی ہے۔ جس پر خصوصی
 غور کیا جاسکے۔“ ابا جی نے کہا ملاقات کی درخواست تب کی جاتی ہے جب اس کی

خواہش ہو۔ یہ ملاقات تو آپ کے خلیفہ صاحب کی ضرورت ہے۔ میں اپنی سرکاری ڈیوٹی نبھانے آیا ہوں۔ ”ملاقات نہیں ہوتی تو نہ سہی“ یہ کہہ کر ہم وہاں سے نکل آئے۔ ابھی گیٹ عبور بھی نہیں کیا تھا کہ ظہور باجوہ بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا ”صوفی صاحب! آئیے حضور یاد فرما رہے ہیں۔“

”اب کیا ہوا“ اباجی نے پوچھا۔

”ہوا یہ کہ جب آپ نکلے ہیں تو انٹرکام پر میری ”حضور“ سے بات ہوئی تو میں نے آپ کا ذکر کر دیا جس پر انہوں نے کہا کہ ”صوفی صاحب کو فوراً بلایا جائے۔“ ظہور باجوہ نے کہا۔

ہم واپس آ گئے۔ پھر ہمیں مرزا ناصر نے اپنے دیوان خاص میں بلایا۔ یہاں عجیب قسم کا طلسمی اور پر اسرار ماحول تھا۔ معطر اور سحر آفریں فضا میں یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی لوزی دنیا ہو۔ یہاں ہی میں نے وہ طلسمی صندوق بھی دیکھا جسے زائرین اور ملاقات کے لئے آنے والے اپنے نذرانوں سے بھر دیا کرتے تھے۔

مرزا ناصر سے بات چیت کے دوران اباجی نے ظہور باجوہ کے رویے کی شکایت کی تو اسے طلب کر لیا گیا۔ مرزا ناصر نے سرزنش کرتے ہوئے کہا ”باجوہ صاحب! آپ ایک مدت سے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں مگر افسوس ہے کہ آپ کو لوگوں کی پہچان نہیں ہوئی“ صوفی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو یہاں آتے ہیں تو یہ ان کی مہربانی ہے۔ نہ آئیں تو بھی ہم ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ آپ ان سے معذرت کریں اور آئندہ ایسی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ ظہور باجوہ نے والد صاحب سے باقاعدہ معذرت کی۔

مرزا ناصر احمد بھی اپنے والد مرزا محمود احمد کی طرح تعدد ازدواج کے زبردست شوقین تھے مگر ان کی بیوی منصورہ نے ان کی لگام ایسے کھینچ کر رکھی ہوئی تھی، وہ ادھر ادھر منہ تو مار لیتے مگر اس کی زندگی میں دوسری شادی کو شش کے باوجود نہ کر سکے۔ لیکن جو نبی منصورہ آنجہانی ہوئی تو مرزا ناصر نے اس لڑکی سے شادی رچالی جو مرزا

لقمان کی محبوبہ تھی۔ باپ بیٹے میں بہت جنگ ہوئی۔ لقمان نے یہاں تک کہا ”ابا حضور! بچ میں نے بتائی مگر بیٹنگ آپ نے کر ڈالی“ مرزا ناصر احمد نے نوجوان دلہن کی برابری کرنے کے لئے طب یونین اور ہومیو پیتھک کے کئی نسخے آزمائے۔ انہی نسخوں نے آخر کار انہیں جہنم واصل کر دیا۔ اکثر مرزائی منچلے کہا کرتے تھے کہ ”ہمارے حضرت صاحب کو گھونگٹ کی ہوا لگ گئی ہے۔“

پلے بوائے

مرزا طاہر کو جب میں نے دیکھا وہ ایک مکمل ”پلے بوائے“ تھے۔ منہ میں پان‘ جیب میں کپشن ڈالے سرخ رنگ کی لیڈیز سائیکل پر پھرنے والا یہ شخص شہر بھر کی خواتین کے دل کی دھڑکن تھا۔ عمر کی قید سے قطع نظر ہر خاتون ان سے تعلق و واسطہ پر فخر کیا کرتی تھی۔ نوجوان خواتین تو بڑے ناز سے انہیں ”میاں تاری“ کہا کرتی تھیں۔

مرزا طاہر بھی اپنے بڑے بھائی مرزا ناصر کی طرح ہو میو پیٹھک ڈاکٹر تھے۔ ان کا کلینک صبح اور شام کھلا کرتا جہاں ماہِ رخاں شہر کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ کسی خاتون کو کوئی مرض ہو یا نہ ہو، وہاں جا کر دل پشوری کر لیا کرتی تھی۔ کسی نوجوان لڑکی کے پیٹ میں ہلکا سا درد بھی اٹھا والدین اسے تریاق لینے میاری تاری کے پاس بھیج دیا کرتے۔

۱۹۶۶ء کی شدید گرمیوں کی ایک صبح کو ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو گرے رنگ کی پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس ایک خوبصورت نوجوان سامنے کھڑا تھا۔ گورا رنگ، چہرے پر ہلکی اور بکھری بکھری سی ڈاڑھی تھی۔ جبکہ ہونٹ پان سے سرخ تھے۔ موصوف نے مسکراتے ہوئے کہا:

”آپ غالباً“ صوفی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔“

”کہاں جی بالکل ہوں۔“

”تو کیا صوفی صاحب گھر پر موجود ہیں“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”میں نے کہا، جی ابا جی گھر پر ہیں۔“

”انہیں اطلاع کریں کہ مرزا طاہر آئے ہیں۔“

میں نے ”اچھا“ کہا اور اندر جا کر ابا جی کو اطلاع کی۔ انہوں نے مجھے بیٹھک کھولنے کو کہا اور خود باہر چلے آئے اور مرزا طاہر کو لے کر بیٹھک میں آ گئے۔ مرزا

طاہر نے ابا جی کو بتایا ”میں صبح صبح اپنی زمینوں پر گیا ہوا تھا۔ واپسی پر میں نے سوچا کہ آج صوفی صاحب کے ہاں ناشتہ کیا جائے۔“

ابا جی مسکرائے اور کہا ”جناب جتنا دل چاہے ناشتہ کریں۔“ کافی دیر تک مرزا طاہر نے اپنی زمینوں اور زراعت سے متعلق باتیں کیں پھر ابا جی نے پوچھا ”جی صاحب! فرمائیں ناشتہ میں کیا چلے گا؟“

مرزا طاہر نے کہا ”آج تو پراٹھے اور خربوزے کا ناشتہ کریں گے اور اگر ساتھ سرکہ ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔“

ان دنوں پیاز پر سرکہ ڈال کر کھانے کا بہت رواج تھا۔ سب چیزیں گھر میں موجود تھیں۔ مرزا طاہر نے ناشتہ کیا کافی دیر تک نشست جمائی اور چلے گئے۔ یہ تھی مرزا طاہر سے میری پہلی ملاقات۔

مرزائیوں کی تنظیم مجلس خدام احمدیہ درحقیقت جماعت کی ایک ایسی فوج ہے جس سے ہر جائز و ناجائز کام لیا جاسکتا ہے۔ ان میں بہت سے جرائم کے بادشاہ ہیں اور اس فوج کے کمانڈر مرزا طاہر تھے۔ یہ صبح اپنا کلینک بھگتا کر خدام الاحمدیہ کے دفتر میں آ جاتے اور پھر وہاں مرزائیت کی گھنواؤں سرگرمیوں کے لئے سکیمیں تیار کی جاتی تھیں۔

مرزا طاہر کے کلینک پر مرد و زن دونوں ہوا کرتے تھے۔ لیکن صنف نازک کی تعداد زیادہ ہوتی۔ خواتین کہتی تھیں ”میاں تاری تو باتوں سے مرض دور کر دیتے ہیں۔“ ایک بار موصوف نے ایک خاتون نور احمد عابد کی بیوی رشیدہ بیگم کو کہہ دیا ”آپ کی جوانی تو برسوں قائم رہنے والی ہے“ جس پر موصوفہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ دنوں تک مرزا طاہر کے تاثرات اپنی سہیلیوں کو بتاتی پھری۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ جب یہ بات کسی کو بتاتی تو ساتھ ہی شرم سے گلنار ہو جاتی تھی۔ مرزا طاہر کی نیلی شیشیوں میں سفید دانے دار گولیوں میں کوئی شفا تھی یا نہیں تھی، مگر اس کی ”زبان اور ہاتھ“ خواتین کے لئے بڑے شافی تھے۔

مرزا محمود کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تخریب کارانہ ذہن کے مالک تھے۔

جماعت میں سے کہیں سے کوئی تنقید یا فتنہ سرا اٹھاتا تو وہ بڑی چابکدستی کے ساتھ اسے دبا دیا کرتے تھے۔ اس کے لئے اعلیٰ درجے کے مخبر رکھے جاتے جو اول تو فتنہ اٹھنے ہی نہ دیتے اور کہیں کوئی ”ایثار میلی“ نظر آتی ان کے کارندے وہاں پہنچتے اور صورت حل پر قابو پا لیا کرتے تھے۔ مرزا محمود احمد کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری بھی مرزا طاہر نے اپنے سر لے لی۔ آل نبوت کے کالے کرتوتوں پر اگر کسی شخص نے انگشت نمائی کرنے کی کوشش کی تو مرزا طاہر نے اس کی گردن وہیں مار دی۔ ربوہ میں ”گردن مارنا اور جلن مار دینا“ کے الفاظ محلوہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ اور یہ جملے خاندان نبوت کے سپوت زیادہ تر استعمال کرتے تھے۔ مرزا طاہر کو دہشت گردی اور تخریب کاری کی علامت اور روح رواں سمجھا جاتا تھا۔ اپنی انہی خوبیوں اور سازشوں کی بنا پر انہیں ”مسند خلافت“ حاصل ہوئی۔

مرزا طاہر کا ایک ڈرائیور ولی محمد ابا جی کا بہت معتقد تھا اور انہیں چاچا جی کہتا تھا۔ اس شخص کو مرزا طاہر کی اصلیت کا علم تھا۔ لہذا وہ اکثر ہمیں ان کی منافقت کی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ اسے ابا جی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جب تمہیں معلوم ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں تو پھر تم کفر کی یہ زندگی چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ ولی محمد مسکرا کر کہتا ”چاچا جی انشاء اللہ مرنے سے پہلے مرزائیت ضرور چھوڑ دوں گا“۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا اس شخص نے جو نہی مرزائیت سے توبہ کی، اور حلقہ بگوش اسلام ہوا، چند روز بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

مرزا طاہر نے تخریب کاری، غنڈہ گردی اور دہشت سے ”جماعت مرزائیہ“ کی جو خدمات انجام دیں، وہ قادیانیوں کے لئے بجا طور پر قابل فخر ہیں لیکن مرزائیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے لئے جو معجزانہ اسباب پیدا ہوئے، وہ بھی قدرت نے مرزا طاہر کی دہشت پسندانہ ذہنیت سے ہی تیار کروائے۔

۱۹۷۳ء میں نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ پر مرزائیوں کا حملہ درحقیقت قدرت کی طرف سے مرزائیت کو نابود کرنے کی پیش قدمی تھی۔ اس آپریشن کا ماسٹرمانڈ مرزا

ظاہر تھے۔ لیکن ان کے تمام منصوبے اور تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں۔ نشتر میڈیکل کے طلبہ بالکل بے قصور تھے مگر مرزائی جماعت نے ان کو سزا دینے کے لئے اپنے جو روستم کی انتہا کر دی۔ تفریحی ٹورز اور سیاحتی دوروں پر جانے والے طلبہ شرارتیں اور ”شغل میلہ“ تو کرتے ہی ہیں۔ ربوہ کے اسٹیشن پر بھی طلبہ نے شور و غل مچایا جو مرزائیوں کو ناگوار گزرا۔ گروپ میں شریک چنیوٹ کے زرگر کے مرزائی بیٹے ڈاکٹر ابرار نے اپنے ساتھیوں سے غداری کی اور ربوہ کے مرکز کو نشتر کالج کے طلبہ کی واپسی کے پروگرام سے آگاہ کیا جس کی بنا پر طلبہ کے خلاف ”آپریشن“ کا منصوبہ تشکیل دیا گیا۔

ان دنوں سرگودھا سے ربوہ تک تمام سٹیشنوں پر تقریباً ”مرزائی سٹیشن ماسٹر بقینات تھے۔ ان کو خصوصی ہدایات دی گئیں کہ طلبہ کی گاڑی جو نئی ان کے سٹیشنوں پر رکے تو اس کے قیام کا دورانیہ بڑھا دیا جائے۔ تاکہ مرزائی غنڈے اطمینان سے طلبہ والے ڈبے سے ملحقہ بویگوں میں سوار ہو جائیں۔ اس کے علاوہ دوسری طرف اس روز یعنی ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو تعلیم الاسلام کالج میں فرسٹ ایئر اور فورٹھ ایئر کا رزلٹ آؤٹ ہونے والا تھا۔ اس کے بارے میں خاص منصوبہ بندی کی گئی تاکہ ”آپریشن“ کے دوران طلبہ سٹیشن کی طرف نہ آئیں۔ دنیا جانتی ہے کہ کالجز میں طریقہ کار کے مطابق فرسٹ ایئر اور تھرڈ ایئر کے سالانہ امتحان کے نتائج نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیے جاتے ہیں۔ طلبہ کو خود ہی اپنے فیل پاس ہونے کا پتہ چل جاتا ہے لیکن اس روز سب طلبہ کو کیمسٹری قیصر میں اکٹھا کیا گیا اور رزلٹ اس طرح سنایا گیا جیسے عموماً ”پرائمری سکولوں میں بول کر سنایا جاتا ہے۔ میں بھی تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ رزلٹ کے اعلان سے قبل اساتذہ نے مختلف موضوعات پر تقاریر کیں اور پھر رزلٹ سنایا گیا۔ اس سارے کام پر دو تین گھنٹے صرف ہوئے۔ اس دوران سٹیشن پر مرزا ظاہر کا آپریشن مکمل ہو گیا۔

لوگ بتاتے ہیں ٹرین سرگودھا سے چلی تو مختلف سٹیشنوں سے حسب پروگرام مرزائی غنڈے چناب ایکسپریس میں سوار ہوتے گئے اور جب ٹرین ربوہ پہنچی تو مرزائی

غنڈوں نے طلبہ کے ڈبے کو گھیرے میں لے لیا اور کپار ٹمنٹ میں داخل ہو کر انہیں پلیٹ فارم پر لا پھینکا۔ ربوہ کے اسٹیشن ماسٹر مرزا عبدالمسیح نے اسٹیشن پر گاڑی کو زیادہ سے زیادہ دیر روکے رکھا اور مرزائی غنڈے مرزا طاہر کی سرکردگی میں کام انجام دیتے رہے۔

نشر کلج کے طلبہ پر جو تشدد کیا گیا، اس کی تفصیلات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ ربوہ کے ریلوے اسٹیشن کے کراسنگ پل پر ”حوریں“ اپنے ”شیر جوانوں“ کی ہمت بندھانے اور نئے طلبہ کو انجام تک پہنچانے کے لئے ”رزمیہ شاعری“ کرتی رہیں۔

طلبہ کو ادھ موا کر کے گاڑی روانہ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس روز مرزائیوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کہ انہوں نے ربوہ میں مسلمان طلبہ کو بدتمیزی کی سزا دے دی۔ ہم لوگ کلج سے نکلے تو سب سے پہلے مجھے میرے ایک کلاس فیلو عبدالحی طاہر نے اس قصے سے آگاہ کیا اور کہا کہ آج نشر کلج کے غیر احمدی طلبہ کا حذب چکا دیا گیا ہے۔

ربوہ شہر میں ایک جشن کا سہل تھا لیکن شام ہوتے ہی ساری خوشیوں کی بھی شام ہو گئی۔ پورے ملک میں اس واقعہ سے غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اگلے روز ہنگاموں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا جو مرزائیوں کو کافر قرار دینے پر ختم ہوا۔ مسلمانوں نے مرزائیوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ ربوہ میں ٹرین اور بسیں رکنا بند ہو گئیں۔ سبزی، گوشت اور اشیائے صرف کی ترسیل رک گئی اور ربوہ ملک بھر سے کٹ کر رہ گیا۔ انتظامیہ نے اس واقعہ کو محض طلبہ کا جھگڑا قرار دے کر معاملہ دبا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں اس وقت کے جھنگ کے ایس۔ پی ملک یارن خان نے تعلیم الاسلام کلج کے پرنسپل چودھری محمد علی سے مل کر کہا کہ ہوسٹل کے دو تین سولہ کے گرفتار کروا دیئے جائیں تاکہ وقتی طور پر ملک بھر کے ہنگاموں کو سرد کیا جاسکے۔ لیکن قدرت نے مرزائیوں کو انجام تک پہنچانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ چودھری محمد علی

سے سنگین سیاسی غلطی ہوئی اور انہوں نے ہوشل کے طلباء کو گرفتار کرانے سے انکار کر دیا۔ ملک بھر میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کے مطالبے زور شور سے ہو رہے تھے۔ انتظامیہ مرزائیوں کی گرفتاریوں کو یقینی بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جب ہوشل سے کوئی لڑکانہ ملا تو ملک یارن خان نے ربوہ کے شہریوں اور دکانداروں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ یہاں بھی قدرت کا کمال ملاحظہ ہو پولیس نے جن افراد کو گرفتار کیا، درحقیقت وہی سانحہ ربوہ کے مجرم تھے۔ پرنسپل کی اس روش پر مرزا طاہر اور مرزا ناصر بہت سیخ پا ہوئے مگر اب چڑیاں کھیت چک چکی تھیں۔ وہ پرنسپل کو ملازمت سے برطرف بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ ۷۲ء میں تعلیمی ادارے قومیاے جانے کے بعد موصوف سرکاری ملازم تھے۔ بہر حال چودھری محمد علی کی مرکز کی طرف سے کافی کلاس ہوئی۔

بعد ازاں اس واقعہ کی تحقیق جسٹس کے ایم۔ صدانی کی سربراہی میں تشکیل دیے گئے ایک کمیشن نے کی۔ مرزا ناصر کو قومی اسمبلی میں علماء کے روبرو پیش کیا گیا۔ علماء کی بحثوں نے مرزا ناصر کے چھکے چھڑا دیئے۔ وہ پسینے سے شرابور ہو جاتے اور ایک ہی نشست میں سات سات گلاس پانی پی جاتے اور ساتھ اپنے دادا کو کہتے کہ اس کی کرنی انہیں بھرنی پڑ گئی ہے۔ علماء کی شبینہ روز کوششوں اور دلائل و براہین نے قومی اسمبلی کو اس بات پر قائل کر لیا کہ مرزائی کافر اور مرتد ہیں لہذا انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۳ء کو تاریخی فیصلہ ہوا جس کی بنا پر مرزائی کافر قرار دے دیے گئے۔ ربوہ کے مرزائیوں کی اکثریت مرزا طاہر کے اس سیاہ کارنامے کی بنا پر اسے کوستی کہ نہ وہ نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ پر حملہ کرواتے نہ انہیں یہ دن دیکھنا پڑتے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو اس کی گمراہی کی سزا دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اسی میں بعض لوگوں سے کام لیتا ہے اور قوم قہرندلت میں غرق ہو جاتی ہے۔ لیکن مرزا طاہر کی غنڈہ لابی نے لوگوں کے منفی اذہان کو کچھ مدت میں پھر اپنے موافق کر لیا۔ درحقیقت جعلی خاندان نبوت کے پاس اپنے جد امجد کی طرح بے

شمار جھوٹے دلائل ہوتے ہیں جن کے استعمال سے وہ مطلب براری کر لیتے ہیں۔
 مذکورہ واقعے پر مرزا لقمان اور مرزا طاہر کے درمیان بھی گہری ٹھن گئی تھی
 لیکن مرزا طاہر نے انتہائی شاطرانہ پالیسی اختیار کر کے مرزا لقمان کا غصہ سرد کر لیا اور
 اس کو اپنی بیٹی دے کر جملہ ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ پھر سر داماد مل کر سیاہ کاریوں کو
 فروغ دینے میں مشغول ہو گئے۔

جب مرزا ناصر نے ایک ”نوخیز“ لڑکی سے شادی رچا کر عمر رفتہ کو صدا دی تو
 انہیں جہنم سے بلاوا آگیا اور خلافت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو خلافت کے لئے صرف
 خاندان نبوت میں نامزدگیاں اور میچ پڑا کرتے تھے۔ اس بار جماعت کے دیگر لوگوں میں
 شعور خلافت عود کر آیا اور شہری حلقوں میں سے کئی امیدوار میچ کھیلنے آ گئے۔ ان
 امیدواروں میں صوفی بشارت الرحمن قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کا موقف تھا کہ مرزائیت
 کے لئے خدمت اگر خلافت کا پیمانہ ہیں تو ہماری خدمت کسی بھی طالع آزما سے زیادہ ہیں
 مگر مرزا طاہر کی لابی بہت ٹھنڈی تھی۔ چنانچہ خلافت کی گیند خود بخود مرزا طاہر کی کورٹ
 میں جا پہنچی اور یوں صوفی بشارت الرحمن ہاتھ ملتے رہ گئے۔

خلیفہ بننے کے بعد بھی مرزا طاہر نے خوب پر پرزے نکالے۔ مرزائیت کو
 اقلیت قرار دیے جانے والے سرکاری فیصلوں سے ٹکرانے کے لئے حکمت عملیاں تیار
 کی گئیں۔ ایک بار مرزا طاہر نے مسلمان علماء کو مناظرے کا چیلنج کر دیا۔ لیکن علمائے
 کرام نے اس کو دندان شکن جواب دیتے ہوئے کہا ”اے بد بخت زمانہ! مناظرہ تو
 مسلمان علماء کا مسالک پر ہوتا ہے تمہارے ساتھ تو مباہلہ ہو سکتا ہے اور نکلو میدان میں
 مباہلہ کرو۔“ مگر یہ شخص جھوٹا تھا اپنے ”دادا“ کی طرح گھر میں دبک کر بیٹھ گیا۔ جب
 کچھ نہ بن پڑا تو مرزا طاہر کی تخریبی ذہنیت نے مسلمان علماء پر حملے کرانے کا سلسلہ
 شروع کر دیا۔ اور وہ بعد ازاں ایک رات لندن فرار ہو گیا۔

اب مرزا طاہر احمد یٹلائٹ پر ساری دنیا کے مرزائیوں سے خطاب کرتے ہیں
 لیکن یہ ہلت نوشتہ دیوار بن چکی ہے کہ مرزا طاہر اب کبھی ربوہ واپس نہیں آ سکیں گے

بلکہ لندن سے سیدھا جہنم جائیں گے۔ پاکستانی علماء کے خلاف زہر اگلنے والا یہ شخص سیٹلائٹ پر لاکھ خطاب کرے مگر اب انہیں ربوہ میں خطاب کرنے کا کبھی موقع نہیں ملے گا۔

مجھے میرے ایک جاننے والے نے ایک روز کہا ”چلیں آپ کو ماڈل ٹاؤن لے چلیں“ میں نے پوچھا ”کیوں“ کہنے لگا ”آج حضرت مرزا طاہر دُش پر جماعت سے خطاب کر رہے ہیں۔ آپ کو وہ سنوائیں گے۔“ میں نے کہا ”انہیں ہمیں کچھ سنانے کی جرات ہوتی تو وہ یہاں سے بھاگ کر لندن کیوں جاتے۔ ہم کسی بھی بھگوڑے اور خود پر خود ساختہ جلا وطنی کا لیبل لگانے والے جھوٹے شخص کی تقریر نہیں سنتے۔“ اس پر مذکورہ صاحب کا ”لبا“ سامنہ مزید لٹک گیا۔

طلسمی صندوق

میرے ذہن میں یہ سوال اکثر گردش کیا کرتا تھا کہ مرزائی قوم اتنی دولت مند کیوں ہے۔ اس کے خاندان نبوت کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی حالانکہ مل و زر اہل نبوت کا خاتمہ نہیں ہوتی۔ اس سوال کا جواب مجھے میرے کلاس فیلو عبدالسلام عصبی نے نہایت مفصل اور مدلل طریقے سے دیا۔ عصبی نہایت بے ضرر، کھرا اور مرزائی بے زار شخص تھا۔ اس کے والد ماسٹر یوسف پرائمری سکول کے ٹیچر تھے۔ بقول ”اس کے“ اسے احمدیت سے شدید نفرت تھی۔ لیکن والدین کی وجہ سے اس طوق کو گلے لگا رکھا تھا۔ اس کی ہزاری قدرت کو شاید اس قدر پسند تھی کہ ”بیچارہ عصبی“ ابھی جولائی کی دہلیز پر ہی تھا کہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ شخص مجھے مرزائیوں کے اسرار سے آگاہ کیا کرتا تھا۔ بہت سے سمجھ نہ آنے والے مرزائیت کے عقدے کھولنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

مرزائیوں کی اقصائی خوشحالی کے بارے میں استفسار کرنے پر عصبی نے بتایا کہ کسی بھی مذہبی جماعت، سماجی اور سیاسی تنظیم کی کامیابی ٹھوس مالی بنیاد کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ مرزائی نبی اس کے خلفاء اور امت کے ”بیوں“ نے دولت سمیٹنے کے لئے مختلف نظاموں اور پروگراموں پر مبنی ایک نیٹ ورک بنا رکھا ہے جس کے تحت وہ اپنی جماعت کے مظلوموں اور معصوموں کی جیبیں قتل بھی کرتے مگر چرچا نہیں ہوتا۔ تاہم سب مرزائیوں کو یہ بات معلوم ہے کہ ان کے کاشانہ نبوت میں دولت کے انبار کن کن کھیتوں اور کھلیانوں سے آتے ہیں۔

مرزا غلام احمد کسی زمانے میں سیالکوٹ میں رجسٹری محرر تھے انہیں زمین ہتھیانے اور اپنے نام لگانے کے جملہ گر آتے تھے پھر انگریز سے انہوں نے غلام نبوت بھی تو محض مل و زر کے لئے حاصل کی تھی۔ ”مرزا غلام احمد“ نے قادیان کی

ساری زمین لمبی مدت کے لئے پٹے پر حاصل کر لی اور پھر وہ زمین رہائشی پلاٹوں کی شکل میں اپنے ہی پیروکاروں میں فروخت کر کے قیمت حاصل کر لی۔ مگر زمین کے انتقال مرزائی خریداروں کے نام نہ کرائے گئے۔ یوں وہ رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جانے دی۔ دولت تو مرزا قادیانی کے گھر کی لونڈی اسی وقت بن گئی تھی جب انہوں نے انگریز کے کہنے پر کاشانہ رسالت میں نقب لگائی اور جھوٹے نبی بن بیٹھے۔ ”مرزا غلام احمد“ کے مرنے کے بعد یہ ساری دولت اور زمینیں نصرت جہاں کی اولاد کو مل گئیں جبکہ ”بھیا اور اس کی ماں نامراد ہی رہے۔“ مرزا محمود احمد اپنے باپ کے بھی باپ لکے۔ جھوٹ، عیاری، عیاشی اور مکاری میں باپ کو بھی مات کر دیا۔ باپ مسیح موعود تھا تو بیٹا مصلح موعود۔ باپ نبی تھا تو بیٹا خلیفہ۔ باپ لئیرا تھا تو بیٹا راہزن تھا۔ بہر کیف قیام پاکستان کے بعد مرزائی نبی کی آل اور مرزائی امت جب بادل نخواستہ قادیان سے ربوہ آئے تو یہاں مرزا محمود نے باپ والی چال چلی۔ پہلے تو اس نے قادیان کی جملہ زمینوں کے بدلے سندھ میں سونا اگلتی زمینیں کلیم کرائیں اور ان کو مختلف دیہات بنا کر اپنے بیٹوں کے نام لگا دیا۔ عجبی کے بقول سندھ میں ناصر آباد، منصور آباد، مبارک آباد سمیت کئی ریلوے سٹیشن مرزائیوں کے نبی زادوں کے نام ہیں۔ ان زمینوں سے اگلنے والا سونا بھی مرزائی آل نبوت کی تجویروں کو ہی بھرتا ہے۔

اس کے علاوہ مرزا محمود احمد نے ربوہ جس کا اصل نام ”چک ڈمکیاں“ ہے یہاں ۹۹ سال کے لئے غالباً ۱۰۳۴ ایکڑ زمین ایک آنہ فی مرلہ کے حساب سے حاصل کر لی۔ یہ زمین بھی مرزائی امت کو فروخت کر کے اپنے ”مالی گھڑے“ بھر لئے گئے۔ مکان خریدنے کے باوجود زمین کا انتقال کبھی بھی خریدار کے نام نہیں کرایا گیا۔ یوں مرزا محمود احمد نے اپنی امت سے دھوکہ دہی کی بنا پر کروڑوں روپیہ کمایا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی مرزائی خواہ کتنا ہی اس مذہب سے بے زار کیوں نہ ہو وہ صرف مکان کی خاطر ربوہ چھوڑنے کی جسارت نہیں کرتا۔

ربوہ میں مختلف ادارے بھی ہیں جو خود ساختہ قوانین کے سارے چل کر اپنی

امت سے پیسے بٹورنے کے لئے حیلہ جوئی کرتے ہیں۔ ان اداروں اور دفاتر میں امور عامہ، تحریک جدید، فضل عمر فاؤنڈیشن، فضل عمر ہسپتال اور مجلس خدام احمدیہ شامل ہیں۔ یہ سب سونے کی مرغیاں ہیں جو مسلسل سونے کا انڈہ دے کر جماعت کے ”بنوں“ کے خزانے بھرتی رہتی ہیں۔

عبدالسلام عبی نے صرف فضل عمر ہسپتال کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ہسپتال درحقیقت ایک خیراتی ہسپتال ہے جس کی تعمیر لوگوں کے عطیات سے ہوئی ہے۔ ہسپتال کے ہر کمرے کے باہر نصب تختی یہ بتاتی ہے کہ اس کمرے کا خرچ کس نے دیا ہے۔ یہاں ادویہ لوگوں کے صدقات و خیرات سے آتی ہیں۔ انتہائی قیمتی آلات جماعت کے خون پسینے کی کمائی سے لائے گئے ہیں لیکن علاج کی سہولیات و مراعات صرف ”بالا بلندوں اور منہ لگے“ لوگوں کو حاصل ہیں۔ جہاں تک غریاء کا تعلق ہے انہیں دوا ملے نہ ملے لیکن دھکے ضرور ملتے ہیں۔ ہسپتال کی باگ ڈور ”مرزا منور“ کے ہاتھ میں ہے جن کی رسائی ہے ان کے وارے نیارے، نہیں تو جہنم میں گئے سارے۔“

”دیگر دفاتر میں بظاہر جماعت کے بے شمار لوگوں کو ملازمتیں حاصل ہیں لیکن حقیقت دیکھی جائے تو ہر شخص اک عذاب سے دوچار ہے جو جماعت کے لئے کام کر کے قلیل معلوضہ لیتا ہے لیکن اس میں سے بھی ایک حصہ جماعت والوں کو دے دیتا ہے۔“ یہ بات تو میرے اپنے مشاہدے میں بھی آئی ہے کہ ہمارے ایک دوست کا بھائی تحریک جدید میں ملازم تھا۔ اس کی آمدن اس قدر قلیل تھی کہ اس کی بیوی دور افتادہ ایک گاؤں میں ملازمت کر کے بچوں کا پیٹ پالتی تھی۔ حالانکہ جس دور کی یہ باتیں ہیں خواتین کی ملازمت کا رواج بھی نہیں تھا۔

ٹائون کمیٹی ربوہ جس کی چونگیوں کے ٹھیکے اور دیگر معاملات پر بھی مرزائی جماعت کی اپنی گرفت تھی۔ مرزا انور اس کا کرتا دھرتا تھا اور مال کما رہا تھا۔ شہر کے گرد پھیلی ہوئی پہاڑوں کی وسیع و عریض چادر کے تمام ٹھیکے مرزا ناصر کے بھائی مرزا رفیق کے پاس تھے اس نے ان کو ”سب لیٹ“ کر رکھا تھا۔ لڑکے لڑکیوں کے سکول و کالج بھی

دولت کے دریا تھے۔ یہاں طلبہ سے تو سرکاری نروں کے مطابق فیس لی جاتی تھی جبکہ اساتذہ کو بہت کم تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ جب تعلیمی ادارے قومیائے گئے تھے تو ان اداروں کے اساتذہ نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

چندے جن کی کئی اقسام تھیں، وہ بھی مرزائی خاندان نبوت پر ”ہن“ برساتے اور اس ”شجر“ ممنوعہ کو شلواب رکھتے تھے۔ اطفال کا چندہ بچوں سے ناصرات کا چندہ لڑکیوں سے، خدام کا چندہ نوجوانوں سے، لجنہ اماء اللہ کا چندہ خواتین سے اور انصار اللہ کا چندہ بوڑھوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ چندہ وصیت سمیت کئی چندے کالے قوانین کی طرح اس امت پر مسلط تھے اور انہیں گمن کی طرح چٹ رہے تھے۔ جامعہ احمدیہ مرزائیوں کی ”مبلغ ساز“ فیکٹری تھی جس میں مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے تبلیغ کرنے والا خام مل تیار ہوتا تھا۔ جماعت کی خدمت کا جذبہ لے کر یہاں آنے والے مبلغ اپنی زندگی اور زر ادارے کی نذر کرتے اور اسے بخشش کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کی خام خیالی ہے جلد ہی انہیں اصل حالات سے آگاہی ہو جاتی ہے مگر وہ اس کبل کو چھوڑ سکتے ہیں نہ ریچھ انہیں چھوڑتا ہے۔

جماعت کے تمام افراد جن کا کسی نہ کسی حوالے سے کوئی ذاتی کاروبار ہے انہیں بھی آمدنی کا ایک حصہ بلا کسی حیل و حجت کے مرکز کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ بے شمار ”دکاندار“ زمیندار“ صنعت کار“ فیکٹری مالک“ ٹرانسپورٹر اور حکماء ڈاکٹر اپنی دولت پر لگے ہوئے مرزائیت کے **محکم** ٹیکس بڑی باقاعدگی سے جماعت کو دیا کرتے تھے۔ مرزا غلام احمد اور ان کی آل اولاد نے جماعت کو چندہ کی اہمیت اور اقلیت سے اس قدر ہٹانے کر رکھا ہے کہ وہ چلتے پھرتے آتے جاتے سوتے جاگتے چندے کی ادائیگی کو ایک مسنون فعل قرار دیا کرتے ہیں۔ ”چندا اؤکشن“ کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ ایک مرزائی کو مسلمانوں نے قائل کر لیا کہ ”مرزا جھوٹا“ نبی ہے لہذا اسے ماننا خدا اور اس کے رسول کے احکام سے انکار کے مترادف ہے۔ قریب تھا کہ یہ شخص مسلمان ہو جاتا مگر اس نے محض اس وجہ سے اسلام قبول نہیں کیا کہ وہ مرزائیت چھوڑ کر چندہ کسے دے گا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ مرزا ناصر قمر خلافت میں جس جگہ عام لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں وہاں ایک بڑا صندوق رکھا ہے۔ اسے یار لوگ ”طلسمی صندوق“ کہا کرتے تھے۔ ہفتے میں دو روز مرزا ناصر سے عام ملاقات ہوتی تھی۔ جس کے لئے پہلے سے وقت لیا جاتا تھا۔ اور بعض اوقات تو باری بھی بڑی مشکل سے آتی تھی۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملاقات کے لیے آتے تو اس صندوق کا پیٹ بھرنے کے لئے دولت، قیمتی کپڑے اور تحائف، اجناس، خوشبوئیاں اور دیگر عطیات جھولیاں بھر کر لاتے تھے۔ جب مجھے اپنے ابا جی کے ہمراہ قمر خلافت جانے کا موقع ملا تو میں نے وہ صندوق دیکھا جسے مدے مسدود کر صدقات دینے والے بھرتے تھے۔ لوگ آتے صرف ”السلام علیکم“ کہتے، دعا کی درخواست کرتے اور روپے، زیور، بانڈز اور اپنی متاع گراں اس صندوق میں ڈال کر چلے جاتے۔ اس صندوق کی ساری آمدن صرف اور صرف ”مرزا ناصر احمد“ کی ہوا کرتی تھی۔ یہ سب تو آمدن کے جائز اور ظاہری ذرائع تھے جن سے مرزائیت پھل پھول رہی تھی۔ اس کے علاوہ بے شمار ناجائز ذرائع بھی مرزائیت کو پال پوس رہے تھے۔

یہود و ہندو اور عیسائی اقوام مسلمانوں کی جس قدر دشمن ہیں، اس حقیقت سے انکار اور فرار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اسلام میں دراڑیں ڈالنے اور مسلمانوں کو ان کی مقصدیت سے دور کرنے کے لئے ”مرزا غلام احمد“ کو نبی بنایا۔ انگریز نے اپنے خود کشتہ پودے کو تنکور درخت بنانے اور زندگی بھر ہرا بھرا رکھنے کے لئے ہمیشہ آب زر سے اس کی آبیاری کی۔ اس کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے آج بھی اسرائیل اسے دولت کی کھلو فراہم کرتا ہے۔ بہت سے غریب اور بے زار مرزائی تب بھی اور آج بھی اس بت کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ مرزائیت عالمی قوتوں کی مضبوط کردہ جماعت ہے۔ ورنہ اس کی ذاتی، مذہبی اور سماجی طور پر کوئی حیثیت نہیں۔ ایک مرزائی کلاس فیلو نے مجھے ایک بار بتایا کہ اگر سارے احمدی ہمت کر کے جماعت کو چندے دینا بند کر دیں جو ”جنگ ٹیکس“ کے طور پر وصول کیے جاتے ہیں، مرزائی جماعت کی سانس بند ہو جائے۔

چندوں کی آکسیجن نے ہی درحقیقت اسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ لیکن ایسا ممکن نہیں۔ مرزائی نبی اور خلفاء نے یہ نظام اس مضبوطی سے چلایا ہے کہ اس کو توڑنا خاصا مشکل کام ہے لیکن وقت کی ضربیں خود بخود اسے کمزور کر رہی ہیں۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ربوہ میں چندہ دینے والے غریب، وصول کرنے والے در ماندہ و پسماندہ جب کہ چندہ جن کے لئے لیا جاتا ہے، وہ مضبوط اہل ثروت اور حکمران ہیں۔ ستم ظریفی کا یہ عالم ہے کہ اپنے ہی دیے چندوں میں سے مرزائی مستحقین کو جب صدقات و خیرات ملتے ہیں تو وہ قسمت کے مارے اس بات پر نازاں ہوتے ہیں کہ ان کا ”خاندان نبوت“ ان کی مالی امداد کر رہا ہے۔

کو تو وال شہر

”ہتا پہ پوت اور نسل پر گھوڑا بست نہیں تو ضرور تھوڑا“ والی مثل کے مطابق مرزا ناصر کا بیٹا لقمان اپنے باپ بلکہ دادا مرزا محمود احمد کے خصائل کا مکمل پر تو تھا۔ چھٹی جماعت میں یہ ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔ مسلمان کیا اپنے جیسے مرزائیوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اور اگر بھولے سے کسی امتی کے ساتھ ہاتھ ملا لیتا تو وہ مرزائی اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوتے ہوئے گھنٹوں کبھی خود کو کبھی اپنے ہاتھ کو دیکھتا رہتا تھا۔ ایک بد معاش بچپن میں جو ”کچھ“ ہوتا ہے مرزا لقمان ان حقائق کا عین عکاس تھا۔ فرعونؑ خصوصیات، یزیدی اوصاف مرزا لقمان کی شخصیت کا جزو لاینفک تھے۔ کتے پالنا، گھوڑے رکھنا، چادر لور چادر دیواری کے تقدس کو پامل کر کے اپنی جنسیت کی تسکین کرنا اس شخص کی زندگی کے لوازم تھے۔ شرفا کی لاج کو مرزا لقمان نے لچوں کا ققمہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

جن لوگوں نے مرزا محمود احمد کی جوانی دیکھی، ان کا کہنا تھا کہ مرزا لقمان کے سارے چلن اپنے دادا جیسے تھے جس طرح موصوف اپنی تخریبی چالوں سے فتوحات حاصل کرنے کے خوگر تھے اسی طرح لقمان بھی تخریبی کارروائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ طالب علم رہنما رفیق بابوہ نے مرزائیت کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا تو مرزا لقمان نے اس کو ختم کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا۔ اس کی تلاش میں رفیق بابوہ کے بارہ گھرانے میں داخل ہو کر چادر اور چادر دیواری کے تقدس کی دھجیاں اڑا دیں۔

مرزا محمود احمد کی طرح مرزا لقمان بھی امت کی جس حور شامل کو چاہتا، قصر خلافت بلا لیتا اور اپنے دادا کی ”سنت“ ادا کر لیتا تھا۔ شہر کے غنڈوں کی ایک فوج مرزا لقمان کے اشارے پر ہر جرم کرنے پر آمادہ رہتی تھی اور اس بے مہار فوج کا یہ سپہ

سلار کرائے کے بازوؤں سے اپنے مقاصد حاصل کر لیا کرتا تھا۔

مرزا ناصر بھی اپنے اس سپوت سے ڈرتے تھے۔ مرزا لقمان کے بڑے بھائی مرزا فرید نے ایک مرزائی خاندان کی لڑکی اغواء کر لی تو مرزا ناصر نے امت اور لڑکی کے والدین کی اٹک شوقی کے لئے مرزا فرید کو ربوہ بدر کر دیا جبکہ مرزا لقمان ایسے کئی کارنامے انجام دینے کے باوجود ہر گرفت سے بلا تھا۔

ربوہ میں بد معاشوں اور قبضہ گروپ کے کئی وھڑے تھے۔ جن کی پشت پناہی مرزا انور چیئرمین ٹاؤن کمیٹی اور مرزا طاہر کیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے مرزا لقمان نے جوانی میں قدم رکھا ہر بد معاش اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا۔ جماعت اور جھوٹی نبوت کے خاندان کے قواعد و احکام سے سر تلی کرنے والوں کے لئے عقوبت خانے اور ٹارچر سیز قائم تھے جن کی سربراہی بھی مرزا لقمان ہی کیا کرتا تھا۔

شہر میں نوجوانوں کی مختلف ٹولیاں رات کو پہرہ دیا کرتی تھیں۔ ان کی تشکیل بھی مرزا لقمان کے دائرہ اختیار میں تھی۔ انہی گروہوں سے کئی افراد چوری کی وارداتوں میں ملوث ہوا کرتے تھے۔ ایسے تمام چور بھی خلیفہ زادے کے پروردہ تھے۔ ربوہ والے اپنے ساتھ ہونے والے کسی ظلم و زیادتی کی اطلاع پولیس کو نہیں کر سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ مرزائی مرکز کی خود ساختہ امور عامہ سے داد رسی حاصل کر لی جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص پولیس کے پاس جانے کی کوشش کرتا تو اسے نہ صرف مرکز کے انصاف بلکہ جماعت سے بھی محروم ہونا پڑتا تھا۔ مرزا لقمان ربوہ کے نام نہاد نظام انصاف کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔

چودہ سو سال قبل عرب کا معاشرہ جس اخلاقی انحطاط کا شکار تھا، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے خالق کائنات نے حضرت نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرما کر معاشرے میں انقلاب برپا کر کے رکھ دیا لیکن قادیان کے جھوٹے پیغمبر کے دعویٰ نبوت کے بعد اخلاقی لحاظ سے ایک ایسے پست معاشرے نے جنم لیا جس کی اصلاح عبث ہو چکی ہے۔ مرزائی خلیفہ وقت کی دو رخی پالیسی کا یہ عالم تھا کہ اغوا کے کیس میں ملوث مرزا فرید کو شہر بدر

تو کر دیا گیا مگر اسے یہ سہولت بھی دے دی گئی کہ وہ جب چاہے ربوہ آ سکتا تھا۔ جس خاندان کی لڑکی اغوا ہوئی تھی، وہ مرزا فرید کو ربوہ میں دیکھتا تو خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا مگر مرزا لقمان کے خوف سے ان میں دم مارنے کی بھی مجال نہیں تھی۔

ربوہ میں ”قدے“، ”چمدے“، ”کے“، ”بیر بے“، ”مقصودے“ پٹھان اور لطیف ”نھے“ جیسے ناموں سے موسوم بد معاشوں کے کئی دھڑے تھے۔ ان گروپوں کی آپس میں لڑائی اور پھر ان میں فیصلہ کر کے اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کے لئے مرزائی خاندان نبوت نے ”لڑاو“ اور حکومت کرو“ کا اصول بنا رکھا تھا۔ ابتدائی صفحات میں ایک پٹھان کا ذکر کیا گیا ہے مذکورہ بد معاشوں کے گرد ہوں میں مقصودا پٹھان گروپ کا مقصود خان اور اسی کا بیٹا تھا جب کہ اس کے دیگر دو بھائی ریتقا پٹھان اور فاروقا پٹھان بھی اپنے بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر وقت اپنے خلیفہ زادے کے حکم کے غلام رہتے تھے۔

مقصود پٹھان وغیرہ بے شک مرزائیوں کے ہاتھوں میں کٹہ پتلی تھے، مگر جب سے ان کے ماں باپ مرزائیت سے متنفر ہوئے، ان کے دل میں بھی جھوٹی بنوت کے دعویداروں کے خلاف گرہ پڑ گئی تھی۔ مرزا انور نے ایک بار مقصودے پٹھان کو غنڈہ گردی کا کوئی معرکہ سرانجام دینے کے لئے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ ایسی حکم عدولی کمل برداشت کی جاسکتی تھی۔ بس پھر کیا تھا، مرزا لقمان، مرزا طاہر اور مرزا انور نے آپس میں سر جوڑ لیے اور مقصودے پٹھان اور اس کے بھائیوں کو سبق سکھانے اور ٹھکانے لگانے کے لئے بد معاشوں کے کئی گروپوں کو پٹھان بھائیوں کے پیچھے لگا دیا گیا۔ ان پر کئی بار حملے کرائے گئے۔ ایک بار مرزا انور کی سرکردگی میں مقصودے کے گھر پر زبردست حملے کا منصوبہ بنایا گیا۔ مقصودا پٹھان نہایت سخت گیر انسان تھا کہ ایک بار اس کے پالتو کتوں میں سے ایک نے فریج کا دروازہ کھول کر گوشت نکالا اور کھا لیا۔ اس پر مقصودے کو اتنا شدید غصہ آیا کہ اس نے کتے کو چاروں ٹانگوں سے پکڑ کر دیوار کے ساتھ اس زور سے مارا کہ اس کا بھیجا نکل کو دور جا گرا۔ پھر اس کتے کو درخت سے لٹکا دیا تاکہ دوسرے کتوں کو سبق حاصل ہو اور وہ ایسی حرکت نہ کر سکیں۔

ایسے مزاج کے شخص سے کسی بھی سلوک کی توقع کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ پٹھان بھائیوں کو جب مرزائی حملے کی خبر ہوئی تو انہوں نے بھی تیاری کر لی اور گھر کے اندر سے جوابی حملہ کا پروگرام بنایا۔ مرزا القمان، مرزا انور اور مرزا طاہر کی غنڈہ فوج شام ڈھلے پٹھانوں کے گھر کی طرف بڑھی۔ تینوں بھائی گھر سے باہر آنے لگے تو ان کی ماں نے انہیں روک دیا اور کہا کہ اس بار وہ اس جھوٹے خاندان نبوت کا مقابلہ خود کرے گی۔ جس کی مدت سے وہ پیروکار رہی اور جن پر میری وجہ سے تمہارا باپ بھی ایمان لے آیا۔ بہادر خاتون بندوق لے کر چھت پر چڑھ گئی اور اس سے پہلے کہ حملہ آور فائرنگ کرتے اس نے نشانہ لے کر گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ مرزائی سلاہ اور ان کی فوج کے پاؤں اکٹڑ گئے۔ ان کے دو تین افراد شدید زخمی ہوئے جنہیں حملہ آور وہیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اسی رات پٹھان بھائیوں کا باپ ہمارے ہاں آیا اور ابا جی سے کہا ”صوفی صاحب! آج تمہارا بھابھی نے مرزائی تہوت میں کیل ٹھوکنے کا آغاز کر دیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد اس خاندان نے ربوہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے کہ وہ لوگ مسلمان ہو کر چار سہ چلے گئے۔

محمد علی پھل فروش گول بازار میں پھلوں کی ریڑھی لگایا کرتا تھا۔ یہ شخص قصر خلافت کے ان پرانے ملازموں میں سے تھا جو اندر کے بھید اور خاصے کی بات جانتے تھے۔ نہ جانے اس شخص سے کیا خطا ہوئی جس کی بنا پر اسے قصر خلافت کی خدمت سے الگ کر دیا گیا۔ محمد علی نے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے گول بازار میں ریڑھی لگالی لیکن جھوٹے خاندان نبوت پر یہ خوف سوار رہنے لگا کہ محمد علی کہیں ان کے اندر کے راز افشا نہ کر دے۔ یہ خوف بالآخر محمد علی کے قتل پر منبج ہوا۔ اسے کسی نامعلوم شخص نے قتل کر کے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے قریب پہاڑی کے ساتھ عیسائیوں کی بستی میں پھینک گیا۔ مقتول کے لواحقین کے اصرار کے باوجود مرزائی ارباب حل و عقد نے یہ کیس پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے اپنے نام نہاد تھانیدار عزیز بھائی کے

حوالے کر دیا لیکن جب دباؤ بڑھا تو مجبوراً یہ مقدمہ پولیس کو دینا پڑا تاہم مرزائیوں نے یہ قتل عیسائیوں پر ڈال دیا۔ جب پولیس نے عیسائیوں کو پکڑا اور تھانے میں مارا پیٹا تو ربوہ بھر کے تمام خاکیوں نے احتجاجاً ہڑتال کر دی۔ دو تین دن کوڑا کرکٹ اٹھانے جب کوئی نہ آیا تو تعفن نے مرزائی امت اور اس کے آقاؤں کی عقل ٹھکانے لگا دی۔ انہوں نے پولیس کے حکام بالا کی مٹھی اور جیب گرم کر کے عیسائی چھڑا لیے اور یوں محمد علی کا پر اسرار قتل داخل دفتر کرا دیا گیا۔ اس قتل کے محرکات کیا تھے، اندر کے لوگ جب دبے دبے الفاظ میں سرگوشیاں کرتے تو کئی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ کہنے والوں کا کہنا تھا کہ محمد علی قصر خلافت کے خواتین و حضرات کے بست سے رازوں سے واقف تھا۔ ایک بار اس نے اپنے کسی ساتھی ملازم سے یہ بات کہہ دی کہ اسے جب بھی موقع ملا وہ قصر خلافت اور مرزائیت چھوڑ دے گا اور جھوٹے خاندان نبوت کی کہانیاں عام کر دے گا۔ یہ بات ”مذہبی وڈیوں“ کو پتہ چلی تو انہوں نے محمد علی سے اس کا روزگار، مکان اور بیوی بچے چھین لینے کی دھمکی دی جس پر اس نے جواباً ”لکارا کہ وہ بھی اندر کے راز ساری امت میں پھیلا دے گا۔ بعد میں اسے قصر خلافت سے نکالتے وقت یہ سمجھوتہ ہوا کہ ”خاندان“ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا جبکہ محمد علی بھی اپنی زبان بند رکھے گا۔ محمد علی نے کچھ عرصہ تو زبان بند رکھی مگر مرزائیوں کی سی آئی ڈی کو معلوم ہوا کہ محمد علی وقتاً فوقتاً ”خاندان“ والوں کے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ربوہ میں ”خاندان“ کا لفظ صرف مرزا غلام احمد کے خانوادہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ مرزائی خالوں نے محمد علی کو قتل کرا دیا۔ شہر میں اکثر واقف حل لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی ماہر کھوجی محمد علی کے قتل کا کھوج لگائے تو ”کھرا“ مرزا القمان کے گھر جانے لے۔

یہ مرزا القمان کے قول و عمل کا اثر تھا یا مرزا غلام احمد کی تعلیم کی کرامت تھی کہ ربوہ میں عام لڑکے بھی معمولی معمولی باتوں پر اتنی لمبی لڑائیاں کرتے جو کئی کئی ہفتوں اور مہینوں پر محیط ہو جاتیں اور فریقین موقع ملتے ہی مخالف پر حملہ کر دیا کرتے تھے۔

سکول سے چھٹی کے بعد عموماً ”لڑکے گھات لگا کر بیٹھ جاتے اور مخالف فریق کو آتے ہی اپنی زد میں لے لیتے۔ لوہے کے ”کے اور چاقو“ عام سے عام لڑکے کی جیب میں ہوا کرتے تھے۔

ہمارے ساتھ ایک لڑکا نعیم شاہ پڑھتا تھا۔ اس کی لڑائیاں اکثر چلتی رہتی تھیں۔ ایک دفعہ اس کے ایک دشمن نے جو اسی جیسا مرزائی تھا، اس کے سر میں چاقو مار دیا۔ اگر مرزائی لڑکے یہ لڑائیاں مسلمانوں یا کسی غیر مذہب کے لوگوں سے لڑتے تو اس کی سمجھ بھی آتی مگر ان کے لوہے کے کئے اور چاقو تو اپنے جیسے مرزائیوں پر ہی چلا کرتے تھے۔ اس صورت حل پر کئی متاثرین مرزائیوں کا یہ تبصرہ ہوتا تھا کہ مرزا طاہر، مرزا انور اور مرزا لقمان اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کے لئے اپنی امت کے لوگوں کو ایک دوسرے سے لڑاتے اور پڑواتے رہتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی عام لوگوں کے بچے بھی ”ایڈونچر“ بننے کے شوق میں عام سطح پر محاذ کھول لیتے تھے۔ اکثر والدین کو اس وقت سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا جب ان کا بچہ سکول سے واپس آتا تو اس کا گریبان چاک اور ناک و سر لہلہا ہوتے تھے۔

ہماری کلاس میں رشید جوئیہ اور شریف شریفی دو لڑکے پڑھتے تھے۔ دونوں میں کسی بات پر لڑائی ہو گئی۔ چھٹی کے بعد راستے میں دونوں میں مادر و خواہر کی مغالطات کے تبادلے ہوئے اور شریفی نے ایک پتھر رشید جوئیہ کو دے مارا جو اس کی آنکھ کے عین اوپر لگا اور خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ ایسی باتوں کا سدباب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا کہ اگلے روز متاثرہ لڑکوں کے والدین سکول آتے، شکایت کرتے۔ اساتذہ انہیں یقین دہانی کراتے کہ آئندہ انہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اگر بات زیادہ بڑھ جاتی تو ہیڈ ماسٹر صاحب جارج فریق یا لڑکے کو ”چھ چھڑیاں“ لگا دیتے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ ربوہ کے سکول میں ”چھ چھڑیاں“ بہت بڑی اور سنگین سزا ہوا کرتی تھی۔

مرزا لقمان کے بعد ربوہ میں اگر کسی کا راج تھا تو وہ عزیز بھانجری تھا۔ یہ

ہمارے سکول ٹیچر مولوی ابراہیم بھائی کا بھائی اور اٹاک انرجی کمیشن کے ایک سرکردہ آفیسر منیر احمد بھائی کا سر تھا۔ عزیز بھائی نہ صرف مرزا القمان کے عقوبت خانوں اور نارچر سیز کی نگرانی کرتا بلکہ اس کے اپنے بھی تشدد گھرتھے۔ جرم و خطا اور تعزیر و سزا کو جانچنے کا اس شخص کا اپنا ہی معیار تھا۔ ”ستم یہ خوش کبھی لطف و کرم پر رنجیدہ“ کے فلسفے کے مطابق کسی کو معمولی سی بات پر دھن کر کے رکھ دیتا اور کسی کو بڑے سے بڑے جرم پر بھی معافی دے دیتا تھا۔ لڑکوں کے سر پر ٹوپی نہ ہوتی تو انہیں چھڑیوں سے مارتا، کسی کے بال بڑھے ہوتے یا قلمیں لمبی ہوتیں تو سرعام بال کاٹ دیتا تھا۔ اے دیکھ کر مرزائی لڑکوں کی شئی گم ہو جاتی تھی۔ اسے مرکز کی طرف سے اچھی رہائش اور بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ کہنے والے کہتے تھے کہ یہ سب کچھ محض اس وجہ سے ہے کہ عزیز بھائی ”خاندان“ والوں کا بھیدی ہے اور اس ڈر سے کہ کسی وقت کوئی لٹکانہ ڈھادے، وہ لوگ اس کو ہمیشہ خوش رکھا کرتے تھے۔

واقفانِ حل کا کہنا ہے کہ محمد علی پھل فروش کی زبان بندی کے لئے بھی عزیز بھائی کی خدمت حاصل کی گئی تھیں۔ لیکن مقتول اپنی ضد پر اڑا رہا تو اسے ٹھکانے لگانے میں بھی عزیز بھائی نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہ کو تو ال شہر دوپہر ڈھلتے سائیکل پر سوار ہو کر پورے شہر کا گشت کیا کرتا تھا۔

مرزائی اکابرین کی ”ذاتی“ بہادری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ربوہ کے باغی نوجوانوں نے رابعہ انقلابی کے نام سے ایک گروہ بنایا اور رابعہ انقلابی کے نام سے مرزا ناصر کو خط لکھا کہ وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت ربوہ فتح کرنے آ رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا؟ خوف کی ایک لہر نے ”خاندان“ کے ہر مرد کو چوڑیاں پہن کر قصر خلافت میں چھپ جانے پر مجبور کر دیا۔ جبکہ ”امت“ کے نوجوانوں کو قصر خلافت اور شہر کی حفاظت پر مامور کر دیا گیا۔ شہر کے داخلی راستوں پر موجود دھڑے دار شہر میں داخل ہونے والے ہر شخص کی تلاشی لیتے اور کسی اجنبی کو ربوہ میں نہ آنے دیتے۔

یہ صورت حال ایک دو ماہ قائم رہی مگر مرزائی قوم اور اس کے سالار ایک بار

تو خوف سے لرز گئے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ تنویر فوٹو سٹوڈیو کے مالک احمد زمان کے ساتھ پیش آیا۔ یہ لوگ لاری اڈا کے پاس پہرہ دے رہے تھے کہ خواتین کا ایک گروپ شہر میں داخل ہوا۔ ان لوگوں نے حسب معمول انہیں پرسش کئے بغیر ہی شہر میں جانے دیا۔ مرکز کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو فوٹو گرافر اور اس کے ساتھیوں کو قصر خلافت طلب کر کے پوچھا گیا کہ مذکورہ خواتین کو تلاشی کے بغیر کیوں جانے دیا گیا ہے؟ تنویر نے مرزا ناصر کو بتایا کہ خواتین کو نہ روکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ”خاندان“ کی عورتیں تھیں۔ اس پر سوال کیا گیا کہ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خاندان کی خواتین تھیں“ تنویر نے جواب دیا ”آنکھوں سے کیونکہ ایسی آنکھیں صرف خاندان والوں کی ہی ہو سکتی تھیں“ اس معنی خیز جواب نے مرزا ناصر کو چپ کرا دیا۔

منافقت کے چکنے چکنے پات

یہ حقیقت ہر شخص جانتا ہے کہ ملک کی تمام کلیدی آسامیوں پر آج بھی مرزائی براہمن ہیں اور جن دنوں کے حقائق یہاں رقم ہیں تب تو ملک بھر میں مرزائی راج تھا۔ ہر جگہ کی بڑی بڑی کرسی مرزائیوں کے قبضے میں تھی۔ یہ اتفاق کی بات نہیں بلکہ مرزائی نبی اور اس کے خلفاء کی منظم منصوبہ بندی تھی کہ ملک کے اعلیٰ اداروں کی اعلیٰ آسامیوں پر ان کا قبضہ رہے۔ انہی حقائق کے پیش نظر مسلمان کیا مرزائی بھی نوکریوں کے لئے مرزائی خاندان نبوت کے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے۔

ہم لوگ ربوہ آئے تو بھیرہ سے ہمارا ہر جاننے والا نوکری کے لئے ابا جی کے پاس آئے۔ ان کی مدد کے لئے وہ مرزا منصور، مرزا طاہر، میر داؤد، مرزا مبارک، مرزا منور اور بعض اوقات مرزا ناصر سے رابطہ کر کے انہیں سفارشی خطوط لے دیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بھیرہ کے ایک صاحب ”اعجاز احمد“ اور ”عبدالرحمن مانا“ کو ہفتوں ربوہ ہمارے گھر قیام کرنا پڑا۔ جلسہ سلانہ پر تو لوگ ہمارے ہاں ڈیرے ڈال لیا کرتے تھے۔ مرزائی اکابرین ملازمت کے لئے سفارشی خطوط تو دے دیتے لیکن ہر سائل یہ شکایت کرتا کہ متعلقہ حکام مرزائی ہونے کے باوجود اپنے اکابرین کے خطوط کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ یہ بات بڑی حیران کن تھی کہ اتنی موثر سفارش کے باوجود لوگوں کو نوکری نہیں ملتی تھی۔ آخر کار یہ عقدہ بھی ایک مرزائی شہری نے حل کر دیا اور ابا جی کو بتایا ”مرزائی نبوت زادے اپنی امت کے لیے تو جو سفارش کرتے ہیں وہ ”ایک نمبر“ ہوتی ہے جبکہ مسلمانوں کے لئے کی جانے والی سفارش ”دو نمبر“ ہوتی ہے۔ یعنی ان کے سفارشی خطوط پر ایک مخصوص علامت ڈال دی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ”ٹال دیا جائے نوکری نہ دی جائے“

ہمارے ایک رشتہ دار محمد عمر انجم مرحوم کو ڈی سی آفس لاہور میں ملازمت

درکار تھی۔ سابق وفاقی وزیر اور سیکرٹری ایف کے بندیاں ان دنوں لاہور کے ڈپٹی کمشنر ہوا کرتے تھے۔ بندیاں صاحب اگرچہ اباجی کے منہ بولے بیٹے بنے ہوئے تھے اور ان سے کام کے لیے کسی سفارش کی ضرورت نہ تھی۔ تاہم ”سخت کمپینشن“ کی بنا پر محمد عمر انجم مصر تھے کہ بندیاں صاحب کو مرزا طاہر سے سفارش کرائی جائے کیونکہ وہ ان کے کلاس فیلو تھے۔ چنانچہ مرزا طاہر سے بات کی گئی تو وہ فوراً ”مان گئے“ مگر اباجی نے کہا۔

”میاں صاحب! سفارش کرنا مگر وہ والی نہ کرنا۔“

”وہ والی کوئی سو فی صدی صاحب؟“ مرزا طاہر نے پوچھا

”وہی دو نمبر سفارش یعنی ٹال دو نوکری مت دو“۔ اباجی نے بر ملا کہا۔

”اوہو! آپ کو یہ سب کس نے بتا دیا“ مرزا طاہر نے حیران ہو کر کہا۔

اباجی نے کہا ”صاف ظاہر ہے ایسی لنکا تو کوئی گھر کا بھیدی ہی ڈھا سکتا ہے۔ آپ کے کسی امتی نے ہی بتایا ہو گا۔ بہر حال دو نمبر سفارشی خط نہ دینا۔“ اس پر مرزا طاہر نے ”خالص خط“ بندیاں صاحب کے نام دیا۔ تاہم بندیاں صاحب اباجی سے ناراض ہوئے کہ جب ہمارے براہ راست تعلقات تھے تو مرزا طاہر سے سفارش کی کیا ضرورت تھی۔“

ایک بار ایک اور شخص نے اباجی سے آکر گلہ کیا کہ مرزا منصور کی دی ہوئی سفارشی چٹھی سے اس کا کام نہیں ہوا۔ اباجی نے تو جاکر مرزا منصور کی خوب خبر لی۔ جس پر اس نے کہا۔

پیر جی! آپ ناراض نہ ہوا کریں۔ اب آپ ہمارے بھیدی ہو گئے ہیں آئندہ آپ کو ”دو نمبر“ سفارشی خط نہیں دیا جائے گا۔

ہمارا بیلدار متھیا بڑا دنگ اور نڈر مسلمان تھا اس کو مرزائیوں سے متھا لگانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک بار اس نے ایم ایم احمد کے بھائی مرزا مجید احمد سے اپنے کسی عزیز کے کام کے لیے سفارشی چٹھی لی، جو دو نمبر تھی۔ چنانچہ اس کا کام نہ ہوا۔ اس دوران مرزا مجید نے متھیا کو کسی کام کے لئے بلا بھیجا۔ متھیا نے اس کے ملازم سے کہا۔

میں سرکاری ملازم ہوں، کلم باری سے کرتا ہوں، آج احمد نگر کے مرعیشی کی باری ہے۔ اس کا کام کر کے آؤں گا۔

چنانچہ جب متھیلا مرزا مجید کے گھر گیا تو وہ غصے سے بھرے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ ”مسٹر متھیلا! تمہیں معلوم نہیں ہم نے تمہیں بلایا تھا۔“ متھیلا نے کہا ”معلوم ہے تبھی تو آیا ہوں مگر ایک بات یاد رکھیں مجھے ”تم کی بجائے آپ کہیں ورنہ میں بھی اسی طرز تکلم میں بات کروں گا۔“

”میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔“ مرزا مجید دھاڑے۔

”میں سرکاری ملازم ہوں تمہارا غلام نہیں۔ تم رپورٹ کرو گے میں استعفیٰ دے دوں گا۔ رازق اللہ ہے۔ تنخواہ حکومت دیتی ہے، تم نہیں۔ میں تمہارے جھوٹے نبی کی امت نہیں جو تمہارے زیر بار ہوں۔“

متھیلا نے جواب دیا تو مرزا مجید نے اسے احسن فراموش کہہ دیا۔ یہ کہنے کی دیر تھی کہ متھیلا تو بھڑک اٹھا اور کہنے لگا۔

”احسن فراموش ہم ہیں یا تم، ہم سرکاری ملازم ہونے کے باوجود دیانتداری سے تم لوگوں کا کام کر دیتے ہیں۔ تم نے ایک سفارشی رقعہ دیا تو وہ بھی دو نمبر نکلا۔ جس سے کلم بھی نہیں ہوا اور تم احسن نہ جانے کس بات کا جتلا رہے ہو۔“

متھیلا مرزا مجید کی خوب بے عزتی کر کے واپس آگیا اور اس سے پہلے کہ وہ رپورٹ کرتا متھیلا نے خود ہی استعفیٰ دے دیا۔ اباجی نے اس پر مرزا ناصر کو لکھا۔

”آپ کے خاندان والے ہمارے سرکاری ملازموں کو تنگ کرتے ہیں۔ آج مرزا مجید نے متھیلا کے خلاف کارروائی کی دھمکی دی ہے تو کل لا محالہ وہ ہمارے خلاف بھی اقدام کریں گے۔ یہ طرز عمل درست نہیں اس طرح کام نہیں چلے گا۔ متھیلا نے مرزا مجید کے غلط رویے کے باعث استعفیٰ دے دیا ہے۔ لہذا اس سے معذرت کی جائے اور اسے استعفیٰ واپس لینے کے لئے کہا جائے۔“

یہ لکھنے کی دیر تھی مرزا ناصر نے فوری ایکشن لیا اور بالآخر مرزا مجید کو متھیلا

سے معافی مانگنا پڑی۔

ایک بار متھیلا رات کے وقت لالیاں سے ربوہ آیا تو شہر میں خدام الاحمدیہ کی ایک گشتی ٹیم نے اسے گھیر لیا اور پوچھا تم کون ہو۔
متھیلا نے جواب دیا ”مسلمن“۔

ٹیم نے سوال کیا ”مسلمن تو ہو لیکن احمدی بھی ہو کے نہیں۔“
متھیلا نے برجستہ کہا ”ہاں احمدی ہوں مگر مرزائی نہیں، اپنے سچے نبی کالی کملی والے کا غلام ہوں۔“

اس پر ان لوگوں نے کہا ”اسے جانے دو، لگتا ہے یہ غیر احمدی ہے۔“ متھیلا سے نہ رہا گیا فوراً ”جواب دیا ”جس مرزے کو مان کر تم خود کو احمدی کہتے ہو، میں واقعی اس کو نہیں مانتا۔“

شہر میں پوش علاقے کے باسیوں کے لئے نواحی گاؤں ”چھنی“ سے پانی لایا جاتا تھا۔ لیکن لائن کے اس پار کے باسی جن کے ہاں میٹھا مگر پیٹ درد کرنے والا پانی آتا تھا، اس میٹھے پانی کی سہولت سے محروم تھے جو ”آل نبوت“ کو میسر تھی۔ چنانچہ انہیں ناقص پانی پینے سے پیٹ کا مروڑ، مروڑ کر رکھ دیتا تھا۔

غراء پر چندہ کی جو آفت ”مرزائی امت“ کی طرف سے مسلط ہے اس کا تذکرہ اس سے پہلے کئی بار کیا جا چکا ہے۔ ہمارے پڑوس میں چاچا محمد حسین ایک بیمار اور لاچار شخص رہتا تھا۔ اس کی بیوی گھر والوں کا پیٹ بھرنے کے لئے مختلف گھروں کا کام کرتی تھی۔ مگر ان غریبوں کے لئے بھی چندہ دینا لازمی تھا۔ اس کی زبوں حالی دیکھ کر اباجی سے رہا نہ گیا، وہ اسے لے کر مرزا منصور کے پاس گئے اور کہا ”ظالمو! دیکھو یہ شخص کچھ کما نہیں سکتا لیکن تم لوگوں کو پالنے کے لیے چندہ باقاعدگی سے دیتا ہے۔ کچھ تو خوف خدا کرو۔“

مرزا منصور مروتا ”خاموش رہے اور اباجی سے کہا ہم محمد حسین کے لیے وظیفہ کا انتظام کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اسے کمرے میں طلب کیا گیا۔ خوف کے مارے محمد حسین

تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مرزا منصور کا اس کے ساتھ طرزِ مخاطب ایسا تھا جیسا راعی کا رعایا کے ساتھ ہوتا ہے۔

”کیا کام کرتے ہو تم“

”جی جی، بیمار ہوں کوئی کام نہیں کر سکتا۔“ محمد حسین گڑ گڑایا۔

”پھر گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟“۔ مرزا منصور نے پوچھا۔

”حضور! میری بیوی محنت مزدوری کرتی ہے“ محمد حسین نے عرض کیا۔

”اپنا علاج کراؤ اور ٹھیک ہو کر کچھ کام کرو، کام کے بغیر کیسے زندگی بسر ہو سکتی ہے۔“ کتنے پیسوں میں تمہارا گزارا چل جائے گا۔“ مرزا منصور نے شاہانہ انداز میں پوچھا۔

”حضور، خود جیسا پسند کریں۔“ محمد حسین نے التجا کی۔

پھر مرزا منصور نے اباجی سے کہا ”پیر جی آپ فکر نہ کریں اس کا اسی ہفتے ۸۰ روپے ماہوار وظیفہ شروع کر دیا جائے گا۔“

محمد حسین کا ۸۰ روپے ماہوار وظیفہ تو شروع ہو گیا مگر اس کے بلوجود اسے چندہ معاف نہ ہوا۔ ہمارا ایک کلاس فیلو سلیمان ایک مزدور کا بیٹا تھا۔ وہ اتنا غریب تھا کہ اس کے بقول اس کے گھر وال کے علاوہ کبھی کوئی چیز نہیں پکتی تھی۔ مگر وہ بیچارے بھی چندہ دیتے تھے۔ مرزائی مظلوموں پر ان کی جماعت سل میں صرف ایک بار لطف و کرم کرتی اور وہ جلسہ سلانہ کے ایام تھے جب انہیں ۹ دن مرکز کی طرف سے کھانا دیا جاتا تھا وہ صبح کو دال اور رات کو ”سنڈھے“ کے شوربے کی باٹلیاں بھر کر لاتے اور سال بھر کے دیئے ہوئے خراج کا ریوارڈ حاصل کرتے تھے۔

ربوہ کا سالانہ میلہ

ربوہ میں رمضان شریف کو کوئی اہمیت دی جاتی تھی نہ عیدین پر کسی مسرت کا کوئی اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہاں تو بس جلسہ سالانہ ہی عید اور بقر عید تھیں۔ فروری ۱۹۶۶ء کی بات ہے جب ربوہ میں ہمیں پہلا رمضان شریف گزارنے کا موقع ملا۔ ہمارے گھر میں روزہ اور تراویح کی باقاعدہ پابندی ہوتی تھی۔ میں سکول میں روزہ رکھ کر جاتا تو طلبہ میرا خوب مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اکثر ساتھی کہا کرتے:

”او توں روزہ رکھیا ہویا اے۔“

”ہاں تو“ جواب دیا جاتا۔

”روزہ تو طلبہ پر فرض ہی نہیں۔ اس سے پڑھنے والوں کا دماغ کمزور ہو جاتا ہے۔“ یہ مرزائی طلبہ کی دلیل ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مرزائی مکتبہ فکر کا فلسفہ یہ تھا کہ طلبہ، محنت کش اور بوڑھے روزہ سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب نے اس بارے میں اپنے ”باطل نبی“ کا ارشاد سنایا۔

”روزہ رکھنے سے انسان خفی ہو جاتا ہے“

ہمارے ایک استاد محمد ابراہیم بھانڑی اپنے بلوا کی اس فکر کی بنا پر کہا کرتے تھے روزہ جماعت پر اس لئے فرض نہیں کہ ”مسیح موعود“ نے اپنی امت کو اس جسمانی مشقت سے نجات دلا دی ہے۔ ان کا اس سلسلے میں یہ استدلال تھا کیونکہ کام بھی ایک عبادت ہے۔ روزے سے انسان کم غذا لیتا ہے اس وجہ سے کمزور ہو جاتا ہے۔ یوں اس کی استعداد کار کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ کام جیسی عبادت سے محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عبادت کے لئے دوسری عبادت ترک نہیں کی جاسکتی۔

ایک مرتبہ میں اپنے ابا جی کے ہمراہ مرزا ناصر کے فلاسفی کے پروفیسر بیٹے مرزا انس کے تعلیم الاسلام کالج کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ مرزا انس نے ابا جی سے کہا۔

”صوفی صاحب! آپ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ میرا وزن کم ہو جائے۔“
 ابا جی نے کہا ”آپ روزے رکھا کریں۔“

”نہیں صوفی صاحب نہیں کوئی اور بات بتائیں،‘ روزہ رکھنے کے بعد انسان افطاری میں عام حالات سے بھی زیادہ کھا جاتا ہے۔ چنانچہ وزن کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتا ہے ویسے بھی روزہ قتلِ عملِ عبودیت نہیں۔“ مرزا افس نے جواب دیا۔

ربوہ میں روزہ اور تراویح کے نعم البدل کے طور پر روزانہ نماز ظہر سے عصر تک مسجد مبارک میں قرآن پاک کا درس ہوا کرتا تھا۔ جس میں ایک سپارہ کا ترجمہ و تفسیر بیان کی جاتی تھی۔ یہ درس سننا ہر شخص پر لازم تھا۔ رمضان میں سکول و کالج دوپہر ایک بجے بند ہو جاتے تھے اور تمام طلبہ و طالبات اور اساتذہ مسجد مبارک پہنچ جاتے تھے۔ کوئی طالب علم درس سننے یا نہ سننے مگر وہاں حاضری لازمی لگوانی پڑتی تھی۔ یہ پابندی رمضان کے ابتدائی ایام میں تو سختی سے کی جاتی تھی مگر رفتہ رفتہ لڑکے مسجد کے بجائے ادھر ادھر پہاڑوں میں گھومتے پھرتے رہتے۔ جبکہ اساتذہ بھی درس سننے کے بجائے گھر بھاگ جاتے تھے۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آتا کہ مسجد میں لوگ جاتے ہی نہیں تھے اور مولوی صاحب کو درس دیواروں کو سنانا پڑتا تھا۔ رمضان گزرتا تو عید الفطر اس طرح منائی جاتی جس طرح مسلمان کرسمس مناتے ہیں۔ نہ نئے کپڑے سلوانے کا اہتمام کیا جاتا، دکانیں لگتیں نہ کوئی تفریحی پروگرام ہوتا۔ اس کے برعکس جلسہ سالانہ کی مہینوں پہلے تیاری شروع کر دی جاتی تھی۔

بقر عید پر بھی لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں گوشت دیتے نہ غیروں میں جاتا تھا۔ جبکہ ہر شخص قربانی کا گوشت آدھا اپنے گھر رکھ لیتا اور آدھا صدر محلہ کو بھجوا دیتا محلہ کا صدر گوشت کے ایک کلو کے پیکٹ بنا کر ان لوگوں کے گھروں میں بھیج دیتا جو قربانی نہیں کرتے تھے۔ ہم ربوہ میں کیونکہ اکیلے تھے کوئی عزیز یا رشتہ دار تو نہ تھا۔ چنانچہ جب ہم نے پڑوسیوں کو گوشت بھجوا دیا تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم نے خیل کیا کہ ہم مرزائی نہیں اس لیے یہ گوشت قبول کرنے سے گریز کر

رہے ہیں۔ ہم نے ایک پڑوسی ثناء اللہ زرگر سے پوچھا تو اس نے کہا بات احمدی غیر احمدی کی نہیں، قصہ یہ ہے کہ ”حضور“ کا حکم ہے کہ گوشت خود تقسیم کرنے کے بجائے صدر محلہ کے حوالے کرو وہ خود جس کو مناسب سمجھے گا، بھیجے گا۔

جلسہ سالانہ جسے عیدین پر فوقیت حاصل تھی، جلسہ کم میلہ زیادہ ہوتا تھا مرزائی جلسہ پر حاضری کوچ اور عمرے کے برابر سمجھتے تھے۔ مہینوں سے اس کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ زنانہ اور مردانہ سکول و کالج کے وسیع کھیل کے میدانوں میں ”پرالی“ کے پہاڑ لگ جایا کرتے تھے۔ امیر مرزائی تجوریوں کے منہ کھول دیتے۔ بڑے بڑے شہروں میں شاپنگ کی جاتی جبکہ غریب مرزائی سال بھر کی جمع شدہ، پونجی جلسہ پر خرچ کر ڈالتے تھے۔ ربوہ میں تین لنگر خانے اور ایک دارالنفیضت تھا۔ اول الذکر تینوں سال بھر بند رہتے تھے لیکن جلسہ سالانہ کے دوران ۹ دن کے لئے کھول دیئے جاتے۔ یہاں گائے، بیل، اور بھینسوں کے ریوڑ کے ریوڑ لائے جاتے۔ جلسہ سالانہ پر آئے ہوئے مہمانوں کو صبح کے وقت ”ماش کی چھلکوں“ والی دال اور رات کو ”سنڈھے“ کا گوشت اور آلو پکا کر کھلایا جاتا۔ لنگر خانے سے روٹی کے حصول کے لئے باقاعدہ راشن کارڈ جاری کیا جاتا۔

جلسہ سالانہ پر اندرون ملک اور بیرون ملک سے مہمان آتے جس میں اکثریت اپنے ربوہ میں مقیم رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرا کرتی۔ تمام تعلیمی اداروں میں جلسہ کے دنوں میں چھٹیاں کر دی جاتیں اور ان کے کمروں میں بھی مرد و زن قیام کرتے اور پرالی پر سو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کسی کو جائے قیام نہ ملتی تو وہ خیموں میں سوتے اور ۲۶، ۲۷، ۲۸ دسمبر کی ٹھڑتی راتوں میں اس چندہ خور خاندان کو بد دعائیں دیتے جو سارا سال پیسے لینے کے باوجود ان کے لئے رہائش کا مناسب انتظام بھی نہیں کرتا تھا۔ جلسہ پر سکولوں کے طلباء، اساتذہ، شہریوں اور دیگر دفاتر کے اہلکاروں کی ڈیوٹیاں لگائی جاتیں جو مہمانوں کی خدمت کرتے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے۔ ”طلعی حج یعنی جلسہ سالانہ کے موقع پر ڈیوٹیاں لگاتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا کہ ہر شعبے

میں ڈیوٹی دینے والے ”خوش شکل امرو“ لازمی شامل کیے جائیں تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کے دلکش شوق کو سرد کریں۔ کئی خوب رو لڑکوں کو تختہ مشق بنانے کے لئے جلسہ سلانہ کا انتظار کیا جاتا اور ڈیوٹیوں کی آڑ میں انہیں شکار کیا جاتا تھا۔

مرزائی جلسہ پر اپنے خلیفہ کی تقاریر سننے، شدید سردی میں ”دال اور شورا“ پیتے۔ پرالی پر سوتے، ڈیوٹیاں دیتے اور ”در ٹمین“ کے اشعار پڑھتے تھے۔ ربوہ میں جلسہ پر مختلف شکل لگتے انواع و اقسام کی نمائش لگتی، سرمہ، انگوٹھیاں، مٹھائیاں بیچنے کے علاوہ ”وہ“ دھندا بھی عروج پر ہوتا۔ اکثر لڑکے لڑکیاں اپنی غربت کا دوزخ سرد کرنے کے لئے جلسہ سلانہ کا انتظار کرتے اور ضمیر کو سلا کر مل کما لیا کرتے تھے۔

جلسہ سلانہ پر بہت سے لوگ تماشائی بن کر دوسرے شہروں سے حور و غلمان اور میلہ دیکھنے ربوہ آیا کرتے تھے۔ ایک بار ہماری بھیرہ کی ایک پڑوسن ”زسبی بھائی“ ”ماچھن“ مرزائیوں کا جلسہ دیکھنے ہمارے پاس ربوہ آگئی۔ امی جان اسے جامع نصرت کلج کے زمانہ جلسہ گاہ میں لے گئیں۔ مرزا ناصر کا قاعدہ تھا کہ وہ ہر سال جلسہ سلانہ کے آخر پر تجدید بیعت کراتے تھے۔ میں اور میرا بھائی امی جان کے ساتھ تھے اور وہ ہمارے ساتھ مصروف تھیں کہ اسی دوران مرزا ناصر کی اختتامی تقریر شروع ہو گئی۔ تقریر کے آغاز میں انہوں نے تمام حاضرین جلسہ کو تجدید بیعت کے لئے کہا۔ پہلے قرآنی آیات پھر درود پاک پڑھا گیا۔ بیچاری ”زسبی بھائی“ مرزا ناصر کے پیچھے آیات و درود پڑھنے لگی۔ جونہی مرزا ناصر نے کہا کہ ”میں مرزا ناصر کے ہاتھ پر سلسلہ احمدیہ کی بیعت کرتی ہوں“ ہماری امی جان نے بھاگ کر زسبی کو بازو سے پکڑ لیا اور کہا:

”نی جھلے“ ائمہ مردود تے اپنی بیعت کران لگا ای، تو کافر ہونا اے۔“

زسبی جو روا روی میں مرزا ناصر کے ساتھ ساتھ پڑھے جا رہی تھی فوراً خاموش ہو گئی اور اس نے لاجول پڑھی۔ امی جان نے جب اسے روکا تو ان کی آواز سن کر بہت سی عورتیں ان کی طرف متوجہ ہوئیں کئی ایک نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

”گلتا ہے یہ کوئی غیر احمدی عورت ہے۔“

جلسہ سالانہ پر ”مرزائی حوروں“ کی بھی چاندی ہوا کرتی تھی۔ ان کی ڈیوٹیاں بھی حسین لڑکوں کی طرح مخصوص خدمات کے لئے لگائی جاتیں جن کا فیصلہ خاندان نبوت کے اکابرین کیا کرتے تھے۔ ڈیوٹیوں کی آڑ میں اکثر لڑکیاں گھروں سے باہر بہ آسانی رہ لیتی اور ”من کی مراد“ پالیتی تھیں۔

جلسہ پر ریلوے کے مرزائی حکام اعلیٰ ربوہ میں پہنچ جایا کرتے اور اس موقع پر خصوصی ٹرینیں چلائی جاتی تھیں۔ افسروں کے ”سیلپر“ کئی روز تک ربوہ میں کھڑے رہتے تھے۔ ربوہ کے اسٹیشن پر عام حالات میں کبھی ایک قلی بھی نظر نہیں آتا تھا مگر جلسہ کے ایام میں ہر گلی محلہ میں ایک ہی آواز ”قلی مزدور قلی“ گونجا کرتی تھی۔ سرخ کوٹ پہنے ہوئے لاہور کے لا تعداد قلی ربوہ پہنچ جایا کرتے تھے۔ جلسہ سالانہ کے افسر میر داؤد ہوا کرتے تھے۔ جن کی سرگردگی میں جلسہ کے جملہ کالے امور طے کیے جاتے تھے۔

ملک بھر کے تمام محکموں میں کلیدی آسامیوں پر فاتز اعلیٰ حکام اور آفیر جلسہ سالانہ پر جب ربوہ آتے تو سرکاری رازوں سے اپنے خلیفہ کو آگاہ کرتے اور پھر ان کے مشورے کے بعد پاکستان کو نقصان پہنچانے والے منصوبے تیار کرتے۔ جن دنوں ایک روپے کے نوٹ پر ایم ایم احمد کے ”مرزا مظفر احمد“ کے طور پر دستخط ہوتے تھے مرزائی نازاں ہو کر نوٹ ہمیں دکھایا کرتے۔ ایک مرتبہ جلسہ سالانہ میں مرزا ناصر نے اپنی تقریر میں کہا تھا ”شاہ فیصل“ اور ذوالفقار علی بھٹو مرزا غلام احمد کی بیگمونی کے مطابق ان کی بد دعا سے قتل اور پھانسی چڑھے ہیں اور اب کر قل قذافی کی باری ہے۔ لیکن اتنے برس گزرنے کے بعد مرزا ناصر کی یہ جھوٹی پیش گوئی پوری نہیں ہوئی۔ مجموعی طور پر ربوہ کا جلسہ سالانہ ایک میلہ تھا۔ جہاں ہر چیز کی لوٹ سیل لگی ہوئی ہوتی تھی۔ ہر دکاندار یہ صدا لگا رہا ہوتا کہ ”بولو جی تم کیا کیا خریدو گے۔“

کوفیوں کا شہر

مرزائیت اور بے وفائی میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس بناء پر ہمارے ایک مہربان ربوہ کو کوفیوں کا شہر کہا کرتے تھے۔ کوئی خاصیتوں کے باوجود ربوہ کے پاسی خود کو وفادار اور چنیوٹ کے مسلمانوں کو بے وفا کہتے تھے۔ تاہم مولانا منظور چنیوٹی کے علاوہ انہیں چنیوٹ کی ہر چیز پسند تھی۔ پھر بھی وہ چنیوٹ کو اپنا حریف شہر سمجھتے تھے۔ مرزائیوں کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے جھوٹے نبی کی طرح مسلمانوں کو ہر قسم کی گالی دینے سے گریز نہیں کرتے لیکن اگر انہیں جواباً کوئی تسلی آمیز جملہ کہا جائے تو ان کا چہرہ فوراً اتر جاتا اور وہ ایک ہی گھسا پٹا جملہ بولتے ہیں۔

”یہ تو انسانیت سے گری ہوئی بات ہے“

ایک مرتبہ ہمارے ایک کلاس فیلو نے چنیوٹ کے ایک طالب علم کو ”اہل کوفہ“ کہا جس پر موخر الذکر نے جواباً اسے ”ابن زیاد“ کہہ دیا۔ اس پر مرزائی لڑکے کا موڈ آف ہو گیا اس کی شکل قتل وید تھی یوں لگتا تھا کہ اسے چشم تصور میں واقعی اپنا باپ ”ابن زیاد“ لگنے لگا ہو۔ مرزائیوں میں کوفیوں والی سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ وہ آپس میں شدید دشمن بھی ہوں تو بھی مسلمانوں کی مخالفت میں سیسہ پلائی دیوار بن جایا کرتے ہیں۔ قیام ربوہ کے دوران بے شمار ایسے واقعات ہوئے جب ہمارے جگری دوست مسلمان دشمنی میں اپنے جیسے مرزائیوں سے اتحاد کو ثواب سمجھتے تھے۔ چنیوٹ میں ربوہ کے بے شمار مرزائی آباد ہیں اور تھے لا تعداد کا یہاں کاروبار ہے جبکہ چنیوٹ کے سینما گھر مرزائیوں کو تفریح فراہم کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہر مرزائی چنیوٹ کے خلاف گز بھر کی زبان کھولے ہوئے نظر آتا ہے۔

ربوہ میں سگریٹ نوشی ممنوع تھی مگر لوگ سرعام تمباکو نوشی کرتے تھے۔ ریڈیو لگانا منع تھا۔ مگر ٹیپ ریکارڈر پر دیسی اور بدیسی گانے سننے میں کوئی ممانعت نہ تھی۔

ہماری ایک جاننے والی بی اے کی طالبہ بصیرت ایک گانا ”اولی ٹھنڈک نگاہوں کو تیرے دیدار سے ہو سکے تو آواز دے“ آواز مجھ کو پیار سے، اس لے و لحن سے گاتی یوں لگتا جیسے ملا خود گا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا کلاس فیلو مومن ”چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں“ سنا کر محفل جمالیا کرتا تھا۔ جبکہ اعجاز اکبر ”جہنم نے بوہے اگے چک تن لئی“ مزے لے لے کر گاتا تھا۔ فکیل کی آواز بھی بے مثل تھی۔

ربوہ میں مرزائی نبوت نے سینما نہیں بنے دیا لیکن اس کی ضرورت چنیوٹ سے پوری کرنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہم لوگ جمعہ کی چھٹی گزار کر ہفتہ کو چنیوٹ سے سکول آتے تو ہمارے مرزائی ساتھی سب سے پہلا سوال یہ کرتے کہ شمع اور نیلم سینما میں کون سی نئی فلم آئی ہے۔ قدرت کے قہر سے مالا مال ربوہ شہر میں گرمیوں میں زندگی گزارنا انتہائی مشکل تھا۔ دوپہر کے وقت تو گھر سے باہر نکلنا متدور میں قدم رکھنے کے مترادف تھا۔ اس شہر کی کلر زدہ زمین جنگلی کیکروں کے علاوہ کوئی چیز اگلتی نہ تھی۔ ایسی صورت میں چنیوٹ کا پڑوس ربوہ کے لئے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ صبح سویرے چنیوٹ سے سبزی، ترکاری کے ریڑھے بھر کر ربوہ آتے۔ گوشت گیہوں بھی وہیں سے لایا جاتا۔ اس کے باوجود مرزائی چنیوٹ کو دشمن شہر کہا کرتے تھے۔

۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران چنیوٹ نے مرزائیوں کی جس انداز میں کمر توڑی انہیں اس کا صدمہ تو یاد تھا لیکن انہیں چنیوٹ کے بے پناہ احسان بھول گئے تھے۔ ۶۰ء کی دہائی میں ربوہ میں بنک نہیں ہوتے تھے جبکہ تحریک جدید اور صدر انجمن میں دو غیر قانونی بنک چلتے تھے لیکن بے شمار مرزائی مختلف بنکوں میں ملازم تھے۔ چنانچہ ان میں اکثریت کی خواہش ہوتی کہ ان کی پوسٹنگ چنیوٹ میں ہو جائے اور وہ گھر کے قریب رہیں۔ دواخانہ خدمت خلق کے حکیم بشیر کا بیٹا نصیر شاہ چنیوٹ کے نیشنل بینک میں مدتوں مینجر رہا ہے۔ چنیوٹ کے سرکاری ہسپتالوں میں تقرر کیے گئے مرزائی ڈاکٹروں کی دوڑ لگی رہتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرؤف غنی جیسے بے شمار ڈاکٹر چنیوٹ میں ملازمت

کرتے رہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی سرکاری محکموں کے ملازم چنیوٹ میں پوسٹنگ کروا کے ربوہ میں مقیم رہتے تھے۔

ڈاکٹر شریف وندان ساز، معراج، سراج ٹرنک ہاؤس، احمدیہ دار لباس اور اس قسم کے بے شمار کاروباری ادارے تھے جن کے مالک چنیوٹ میں موجیں کر رہے تھے اور اپنی محسن کشی کی فطرت کے باعث چنیوٹ کو بے وفا لوگوں کا شہر بھی کہا کرتے تھے۔

ربوہ کو پہاڑوں کے لامتناہی سلسلے نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے، جہاں سے پتھر کرش ہو کر دیگر شہروں کو سپلائی ہوتا ہے۔ اب تو ربوہ میں ٹرکوں کے کئی اڈے ہوں گے لیکن اس زمانے میں بحری سپلائی کرنے کے لئے کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ چنیوٹ کے گڈز ٹرانسپورٹ کے اڈوں کے ذریعے ہی ربوہ کا کاروبار چلتا تھا۔ اکثر بحری کے ٹھیکیدار جن کا گھر بار ربوہ میں تھا لیکن وہ دن بھر چنیوٹ میں کام کرتے، جیب بھرتے اور رات کو کفرستان چلے جاتے تھے۔

چنیوٹ کے شہید چوک میں ایک کلینک دارالصحت تھا اس کو ایک مرزائی ڈاکٹر عبداللہ قریشی چلاتا تھا۔ اس کا بیٹا طاہر بن عبداللہ ہمارا کلاس فیلو تھا۔ موصوف اپنی سدومی صفات کے باعث سکول بھر میں چلتا پھرتا اشتہار تھا۔ طاہر بن عبداللہ نے ایک بار بتایا کہ اس کے باپ کا کلینک پہلے ربوہ میں ہوا کرتا تھا، لیکن کلینک پر مریض کوئی نہیں آتا تھا۔ مرزا منور کی اجارہ داری کے باعث دوسرے ڈاکٹر محض ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے تھے۔ چنانچہ طاہر کے والد نے اپنا کلینک چنیوٹ منتقل کیا تو چاندی برسناس شروع ہو گئی۔

ہمارے ایک اور کلاس فیلو احمد شریف کے والد بھی ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے لیکن رحمت بازار میں اپنے کلینک پر سارا دن کھیاں مارا کرتے تھے۔ انہیں بھی کسی نے نیک مشورہ دیا اور کلینک چنیوٹ لانے کے لئے کہا۔ ڈاکٹر شریف اپنا کلینک چنیوٹ کیا لائے ان کی قسمت پھر گئی۔

تحریک ختم نبوت کے دنوں میں جب سماجی بائیکاٹ کے باعث ربوہ ملک بھر سے کٹ کر رہ گیا تب بھی بے شمار مرزائی اپنی فریج کٹ داڑھی صاف اور ٹوپی ٹھکانے لگا کر چوری چھپے چنیوٹ آتے اور وہاں سے سودا سلف لے کر ربوہ چلے جاتے تھے۔ جب چاروں طرف ان کا کوئی پرسان حل نہیں تھا تو ان دنوں میں بھی انہیں چنیوٹ سے ہی سہارا ملتا تھا۔ مرزائیوں کی بڑی تعداد نے جون ۱۹۷۳ء کے دنوں میں چنیوٹ آ کر اسلام قبول کیا اور مرزا قادیانی کی ذات، نبوت اور آل پر تین حرف بھیجے اور زندگیوں کی سہولتوں سے بہرہ مند ہوئے۔

ہماری کلاس میں ایک لڑکا امجد پڑھا کرتا تھا۔ اس کا والد چنیوٹ میں اے ڈی آئی تھا۔ یہ لوگ چنیوٹ سے منتقل ہو کر ربوہ آ گئے تو اس نے مرزائیوں کی احسان فراموشی پر ایک دن بڑی عمدہ بات کہی کہ ہم احسان شناس اس لئے نہیں، ہمارے نبی کی سنت میں ہی احسان مندی کی کوئی مثل ہی نہیں بلکہ ہمارا مذہب تو صرف ”لو“ کی بنیاد پر قائم ہے اس میں ”دو“ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ چنانچہ ہم جیسے پڑھے ہیں، ایسے ہی پڑھائیں گے۔ امجد ترنگ میں آ کر تقریر کر رہا تھا، کہنے لگا ”چنیوٹ ہم کو سینما کی شکل میں بہترین تفریح فراہم کرتا ہے۔ اس کے باوجود اگر ہمیں ہمارے اکابرین کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا جائے تو ہم سب سے پہلے چنیوٹ کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔“

مرزائی یہودیوں کی طرح بڑی سیانی قوم ہے۔ ان کی ”نبوت“ نے اگرچہ انہیں اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے لیکن اس کے باوجود مرزائیوں کی اکثریت اپنے مالی استحکام سے لمحہ بھر کے لئے غافل نہیں ہوتی۔ یہ بات ہر مرزائی جانتا تھا کہ ربوہ میں جائیداد خریدنا اپنا پیسہ کنوئیں میں پھینکنے کے مترادف ہے۔ اسی بناء پر بے شمار مرزائیوں نے چنیوٹ میں جائیدادیں خرید رکھی تھیں، چنیوٹ کے محلہ عثمان آباد میں ایک مرزائی خاندان نے جائیداد کی خرید و فروخت کا باقاعدہ کاروبار کیے رکھا اور مسلمانوں کی زمینیں انہیں سے خرید کر انہیں کو فروخت کر کے خوب مال کمایا۔ ان تمام باتوں کو پیش نظر

رکھا جائے تو ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مرزائیوں نے ہر دور میں چنیوٹ سے فائدہ اٹھایا، مگر ہمیشہ اس محسن شہر کی بدخواہی کی۔ اس سلسلے میں ایک معمر مرزائی خدا بخش کی بات قائل ذکر ہے کہ ”جس طرح مرزائی نہیں ہو سکتا اسی طرح مرزائی وفلدار نہیں ہو سکتا۔“

ربوہ میں قیام کے دوران ہم جمعہ کی نماز پڑھنے چنیوٹ جاتے تو اکثر کلاس فیلو مذاق کیا کرتے تھے کہ آخر تمہیں چنیوٹ میں نماز پڑھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ میں اس کا جواب یہ دیتا کہ تم لوگ چنیوٹ قلم دیکھنے جا سکتے ہو تو ہم نماز پڑھنے نہیں جا سکتے۔ اس پر وہ لوگ کہتے ”بھئی چنیوٹ ہم قلم اس لئے دیکھنے جاتے ہیں کہ ربوہ میں کوئی سینما نہیں لیکن ربوہ میں مساجد ہونے کے باوجود تم لوگ چنیوٹ جمعہ پڑھنے جاتے ہو؟“ میں ان کی زبان بند کرنے کے لئے کہتا کہ ربوہ میں مساجد نہیں مرزائی عبادت خانے ہیں۔ ہم یہاں نماز پڑھ کر اپنی نماز ضائع کیوں کریں۔

مرزائیت گزیدہ

اباجی نہایت سادہ اور درویش صفت انسان تھے۔ عمر بھر زہر ہلاہل کو قد نہ کہنے کے فلسفے پر کاربند رہ کر اپنوں کو خفا اور بیگانوں کو خوش کرتے رہے۔ ان کی بے نیاز شخصیت کا یہ اعجاز تھا کہ ربوہ جیسی غیر مسلموں کی بستی میں بھی دھڑلے سے رہے۔ متعصب لوگوں کے اس دیس میں بھی ان کے عقیدت مندوں کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ مرزا ناصر سمیت ”مرزائیت“ کے بے شمار پجاری انہیں سلام کرنے آیا کرتے تھے۔

بڑے بڑے مرزائی علماء و فضلاء جو ہر وقت مسلمانوں کو گھیر کر ”مرزائیت“ میں داخل کرنے پر ادھار کھائے رہتے تھے اباجی کے سامنے مہربلب ہو جاتے تھے اور ان کی روحانی عظمتوں کو مانتے تھے۔ بے شمار لوگ اباجی کی تحریک پر ”مرزائیت“ سے تائب ہو کر دامن اسلام میں داخل ہوئے۔

مرزائیوں کا یہ قاعدہ تھا کہ ان کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تو وہ اس کا نام رکھنے کے لئے اپنے خلیفہ کو ایک درخواست لکھتے، خلیفہ چند روز کے توقف کے بعد نام رکھ دیتا۔ مرزا ناصر کے بیٹے مرزا انس کے گھر بیٹا پیدا ہوا تو اس نے نام رکھنے کے لئے اباجی سے درخواست کی تاہم انہوں نے مسکرا کر ٹال دیا۔

اباجی مسلسل تیس سال تک ۱۰ ماہ روزے اور رمضان میں اعتکاف کرتے رہے۔ ربوہ میں قیام کے زمانے میں وہ اعتکاف کرنے کے لئے بھیڑ چلے جایا کرتے تھے اور عید الفطر سے اگلے روز واپس آتے تھے۔ اس دوران ہمارا سرکاری ”بیدار“ مہینہ گھر کی اور ہماری نگرانی کیا کرتا تھا۔ ثواب کے اس کام میں اس کی شرکت بہت زیادہ تھی۔ وہ عید ہمارے پاس گزار کر اگلے روز اپنے بچوں کے پاس جایا کرتا تھا۔ اباجی کی شب بیداری اور سحر خیزی کے باعث بے شمار مرزائی عقیدت کے طور پر ان سے ملاقات کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ”تعویذ دھاگے اور دم درود کے منکر ہونے کے باوجود

اکثریت چھپ چھپا کر ہمارے ہاں آتی اور اپنے درد کا درماں روحانی علاج میں تلاش کرتی۔

ہمارے پڑوسی مستری فضل دین کی بیٹی امتہ المتین ایک مرزائی سلیم کی بیوی اور دو بچوں کی ماں تھی۔ سلیم لائل پور (فیصل آباد) میں ملازم تھا۔ وہاں اس کے ایک خاتون سے تعلقات ہو گئے۔ اس نے امتہ المتین کو دھوکے سے لائل پور بلایا اور اس سے دوسری شادی کے اجازت نامے پر دستخط کرا لیے۔ موصوفہ گھر لوٹی تو اس صدمے نے اس پر اس قدر اثر کیا کہ وہ پاگل ہو گئی۔ ابتدائی علاج کے لیے اسے فضل عمر ہسپتال ربوہ میں داخل کیا گیا مگر جب صورتحال قابو سے باہر ہو گئی تو اسے لاہور کے مینٹل ہسپتال میں منتقل کرا دیا گیا۔ کافی علاج کے باوجود اسے کوئی افادہ نہ ہوا تو اس کے گھر والے اسے واپس ربوہ لے آئے۔ اب امتہ المتین دن رات چھت پر چڑھ کر اپنے ماں باپ، مرزائی نبی، اس کے خاندان کو انتہائی فحش گالیاں دیا کرتی تھی۔ اس کے گھر والے اور محلے دار اس کیفیت سے سخت پریشان اور ٹاللاں تھے۔ لیکن عجیب اتفاق تھا کہ وہ ہم سب کے ساتھ نہایت پیار اور ادب و احترام سے پیش آتی۔ اباجی صحن میں نماز پڑھ رہے ہوتے تو وہ بڑی عقیدت سے انہیں دیکھا کرتی۔ ایک روز اس کی والدہ رشیدہ بیگم اباجی کے پاس آئی اور عرض کی ”صوفی صاحب! ہم ہیں تو احمدی“ آپ سے بات کرنا بھلا معلوم نہیں ہوتا لیکن مجبور ہیں۔ آپ ہماری مدد کریں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔“

اباجی نے کہا ”ہن! بتاؤ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

کہنے لگی ”آپ میری بیٹی امتہ المتین کو کوئی ایسا تعویذ دے دیں جس سے وہ ٹھیک ہو جائے۔“ اباجی نے جواب دیا ”آپ لوگ ان چیزوں پر یقین رکھتے ہیں؟ یہ تو ان لوگوں کے لئے ہیں جن کا ان پر کامل اعتقاد ہوتا ہے۔“

اس پر رشیدہ بیگم رونے لگ گئی اور کہا ”احمدیت“ بے شک ہمارا مذہب ہے لیکن اسے ہم نے بادل نخواستہ قبول کر رکھا ہے۔ اسے چھوڑیں تو جائیداد، رشتہ دار

اور سماجی تعلقات جاتے ہیں اس کے اختیار کرنے سے جو کچھ ہم نے کھویا ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ آپ مرہانی فرما کر ہم پر ترس کھائیں مجھ سے اپنی بیٹی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔“

ابا جی نے امتہ المتین کو کچھ تعویذ اور پانی دم کر کے دینا شروع کیا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چند یوم میں وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ وہ ابا جی کی اس قدر معتقد ہوئی کہ باقاعدگی سے آکر دین کی باتیں پوچھنے لگی۔ تاہم ٹھیک ہونے کے بعد بھی اس نے مرزا قادیانی اور اس کے دین کو برا بھلا اور جھوٹا کہنا نہ چھوڑا وہ سرعام کہتی ”مرزا غلام احمد قادیانی ایک جھوٹا اور مکار انسان تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر مرزائی اسے پاگل سمجھتے مگر درحقیقت وہ بالکل نارمل تھی جس کو اس کے گھروالے بھی تسلیم کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے امتہ المتین سے پوچھا کہ تم کس ڈاکٹر کے علاج سے تندرست ہوئی تو اس نے کہا ”میں تو صوفی صاحب کے دم کئے ہوئے پانی سے ٹھیک ہوئی ہوں۔“ سوال کرنے والے مرزائی نے اس بات پر یقین نہ کیا اور دم کئے ہوئے پانی کو لیبارٹری میں ٹیسٹ کروایا۔ جب وہاں پانی محض خالص پانی ثابت ہوا تو وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ مسلمان سچے یا وہ اور اس کا مذہب ”مرزائیت“۔

مرزا ناصر کا چچا زاد بھائی مرزا منصور ناظر امور عامہ ابا جی کو ہمیشہ ”پیر جی“ کہا کرتا تھا۔ ایک بار میں ابا جی کے ساتھ مرزا منصور کے دفتر گیا۔ وہاں ایک شخص مرزا منصور سے گفتگو کے دوران دعا کی درخواست کر رہا تھا۔ جس پر مرزا منصور نے ”ابا جی“ کی طرف اشارہ کر کے کہا ”دعا کرانی ہے تو پیر جی سے کراؤ“ ہم تو انہیں سے دعا کی درخواست کرتے ہیں“ وہ شخص ابا جی کو دیکھ کر کہنے لگا ”کیا یہ صحابی ہیں“ اس پر ابا جی نے کہا ”نہیں میں صحابی نہیں سچا مسلمان اور کالی کملی والے کا غلام ہوں۔“

ربوہ کے ہی ایک مرزائی کی چھ بیٹیاں تھیں۔ ان کی شادیاں نہیں ہو رہی تھیں وہ بہت ہی متفکر تھا۔ اپنے ”مرزوں“ سے بار بار دعائیں کرا کے مایوس ہو چکا تو اسے کسی نے ہمارے ہاں بھیج دیا۔ ابا جی نے اسے کہا کہ تم ”مرزائیت“ سے تائب ہو جاؤ

اللہ تعالیٰ تمہاری مشکل آسان کر دے گا۔ اس نے واقعی ایسا کیا اور قدرت نے چھ ماہ کے اندر اس کی تمام بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کر کے اسے سرخرو کر دیا۔

۲۲ رجب کو حضرت امام جعفر صادقؑ کی نیاز ہم برسوں سے دیا کرتے تھے چنانچہ ربوہ آکر بھی یہ معمول برقرار رہا۔ ہم مرزائیوں کے بجائے چمن عباس سے لوگوں کو بلا کر نیاز کی چیزیں کھلاتے لیکن جب ہمارے مرزائی محلہ داروں کو پتہ چلا تو انہوں نے از خود ہمارے ہاں آکر نیاز کھانا شروع کر دی اور پانچ برس تک کھاتے رہے بلکہ رجب کے آغاز میں ہی نیاز کے بارے میں ہم سے دریافت کرنا شروع کر دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ ہم وادی عزیز میں جمعہ کی نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ بعد نماز وہاں اللہ ہو کا ذکر شروع ہو گیا۔ لوگ آنکھیں بند کر کے اللہ ہو کی ضرب اپنے دل پر لگانے میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ جب ذکر ختم ہوا تو ہم نے دیکھا کہ ربوہ کے بے شمار لڑکے وہاں کھڑے تھے اور حیرت زدہ ہو کر ذکر کرنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ صوفی محمد علی صاحب نے اپنے خادموں سے کہا کہ ان لڑکوں کو یہاں بلا لاؤ، لڑکے آئے تو صوفی صاحب نے پوچھا:

”بیٹا آپ کون ہیں اور یہاں کیا کرنے آئے ہیں“ تو انہوں نے جواب دیا ہم احمدی لڑکے ہیں اور ربوہ سے یہاں شکار کی تلاش میں نکلے تھے، گھومتے گھومتے اس طرف آ نکلے۔ یہاں اللہ کے ذکر کی بلند آواز سنی تو بے ساختہ ادھر چلے آئے۔“

صوفی صاحب نے پوچھا! ”تو پھر تمہیں ذکر کیسا لگا؟“

”ایسا طریقہ ذکر ہم نے کبھی سنا نہ تھا، لیکن اس میں عجیب سی لذت محسوس ہوئی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ہم بھی اس طرح بلند آواز سے اپنے رب کو پکاریں۔“

لڑکوں نے جواب دیا۔ مگر ہمارے ہاں تو نماز کے بعد دعا بھی نہیں مانگی جاتی بلکہ نماز کے بعد کچھ پڑھنے اور کرنے کا سلسلہ اس لئے منع ہے کہ نماز کا مطلب ہی دعا ہے، آپ لوگوں کو نماز پڑھتے یا دعا مانگتے اور خدا کا ذکر کرتے ہوئے دیکھ کر عجیب سا سکون ملا ہے۔ لڑکے بے ساختہ کہے جا رہے تھے۔

صوفی صاحب نے کہا ”تو بیٹا تم بھی اس طرح کا ذکر کیا کرو۔“

”مگر کیسے، ہم تو احمدی ہیں، ہمیں تو مسلمانوں سے ملنے جلنے سے بھی منع کیا جاتا ہے۔ ہم خود مختار بھی نہیں کہ خود کوئی فیصلہ کر سکیں۔“ لڑکوں نے پھر کہا۔

صوفی صاحب نے کہا ”دیکھو بچو، ہم تمہیں اپنے والدین کے خلاف بغاوت کا سبق تو نہیں دیتے لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ خدا کی راہ میں گھربار، والدین اور عزیز و اقارب چھوڑ دینا عین عبادت ہے۔ تمہیں اگر خدا کا ذکر اچھا لگا ہے تو تم اس پر غور کرو، زندگی میں جو نئی موقعہ ملے اس طرف چلے آنا۔ لڑکے بہت متاثر ہوئے اور صوفی صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ خود مختار ہوتے ہی احمدیت سے تائب ہو کر آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے۔“ بعد ازاں سکول میں یہ لڑکے اکثر میرے ساتھ ذکر و فکر کی باتیں کیا کرتے تھے، ان کے ذہن اس قدر تبدیل ہو چکے تھے کہ لگتا تھا کہ زندگی میں موقع ملے ہی کفر و الحاد چھوڑ کر ”دین مبین“ اختیار کر لیں گے۔

مرزائیوں کے زبردست مہروں میں شیخ نور الحق، شیخ شمس الحق ڈپو والے، فاروق جنرل سٹور کے مالک ارشد، پروفیسر محمد شریف خالد سمیت بے شمار مرزائی اکثر و بیشتر اباجی کے پاس حاضری دیتے اور دعا کرانے آیا کرتے تھے۔ اباجی ان سب سے کہتے کہ دعا کا فائدہ تو تب پہنچے گا جب تم طاغوت کے راستے کو چھوڑ کر حق کی راہ پر چلنا شروع کر دو گے، آپ برملا کہہ دیا کرتے تھے کہ ”یہ دنیا اور جاہ و حشمت عارضی ہے تم لوگ کل خدا کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤ گے کہ تم نے ایک سچے نبی ﷺ کے پیروکار ہوتے ہوئے ایک جھوٹے نبی کی پرستش شروع کر دی۔“

یہ تمام لوگ بلا تامل اباجی کی باتوں کو سچا کہتے اور ان کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ صوفی صاحب! آپ سچ کہتے ہیں ہمیں بھی اپنی گمراہی کا پورا احساس ہے لیکن ہم کیا کریں ہماری جان نہیں چھوٹ سکتی آپ ہمارے لئے دعا کریں۔“

ربوہ، جہاں ایک طرف مرزائیت میں ”کانوں“ تک پھنسے ہوئے لوگ اس کفر کی دلدل سے نکلنے کے لیے بے تاب تھے، دوسری طرف وہاں کئی زندیق ایسے بھی تھے

جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے جیسے کافر بنانے کا عہد کر رکھا تھا۔ ایک ”بوڑھا زندیق“ اپنی جماعت کی طرف سے خصوصی بھتہ لینے کی وجہ سے ہر وقت احمدیت کا پرچار کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے اس تبلیغی جنون کی وجہ سے اکثر مرزائی بھی اس سے تالاں تھے۔ ربوہ کے ایک فوٹوگرافر نے اس ”زندیق بڈھے“ کے بارے میں اباجی کو بتایا کہ اس کو لوگوں کے مرزائی بننے سے کوئی غرض نہیں ہوتی، اسے تو اپنی ”دھیازی“ کی فکر ہوتی ہے۔ جب کوئی مسلمان مرزائی چنگل میں پھنس جاتا ہے یہ ”خبیث“ سمجھتا ہے ”دھیازی“ لگ گئی۔

اباجی نے کافی عرصہ تک چمن عباس کی مسجد میں جمعہ کی نماز کا سلسلہ شروع کیے رکھا۔ چنیوٹ کے شریف بخاری صاحب وہاں خطبہ دینے آیا کرتے تھے مگر جب ہم نے ربوہ سے نقل مکانی کی تو یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

اقبال دشمنی

علامہ اقبالؒ نے قلوبانیت کو کھلم کھلا الگ مذہب قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزائیوں کو ان کے ساتھ خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ ہر گھڑی، ہر ساعت علامہ کی مخالفت میں سرگرم رہتے ہیں۔ جن دنوں میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھتا تھا، ان دنوں ملک بھر کے دیگر مدارس میں صبح اسمبلی کے وقت علامہ اقبال کی یہ دعا پڑھائی جاتی تھی۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
 زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
 دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
 ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
 ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
 جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
 زندگی ہو میری پروانے کی صورت یا رب!
 علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب!
 ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
 درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
 میرے اللہ! برائی سے پہچانا مجھ کو
 نیک جو راہ ہو اسی راہ پر چلانا مجھ کو

اس کے برعکس ہمارے ہیڈ ماسٹر ملک حبیب الرحمن کے حکم پر سکول میں اسمبلی کے دوران کلام محمود کی یہ نظم کلام اقبال کا ہم پلہ قرار دے کر پڑھائی جاتی

نومالان جماعت مجھے کچھ کہنا ہے
 پر ہے یہ شرط کہ ضائع میرا پیغام نہ ہو
 خدمت دین کو اک فضل الہی جانو
 اس کے بدلے میں کبھی طالب انعام نہ ہو
 جب گزر جائیں گے ہم تم پہ پڑے گا سب بار
 سبیل ترک کرو طالب آرام نہ ہو
 میری تو حق میں تمہارے یہ دعا ہے پیار
 سر پر اللہ کا سایہ رہے ناکام نہ ہو

جس کو شاعری سے ذرا سا بھی شغف ہے وہ کلام محمود کا اقبال کی شاعری سے
 موازنہ کرنے کی جسارت ہی نہیں کر سکتا۔ لیکن مرزائی علامہ سے محض اس وجہ سے
 بغض و عناد رکھتے ہیں کیونکہ جس طرح انہوں نے پاکستان کا عظیم تصور پیش کیا اسی
 طرح اس پیکر حکمت نے مرزائیت کو خطرے کی گھنٹی قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو
 خبردار کیا کہ قادیانیت، یہودیت کا چہرہ ہے۔

میں قیام ربوہ کے دوران معجز رہا کہ مجھے مرزائیوں کے علامہ سے عناد کے
 اصل اسباب معلوم ہو سکیں تاہم اس بارے میں آغا شورش کاشمیری کی تصنیف 'سید
 عطاء اللہ شاہ بخاری کے سوانح حیات سے لی گئی جملہ تفصیلات یہاں رقم ہیں ان سے
 مرزائیوں کی علامہ سے نفرت کی اصل وجوہات معلوم ہو جاتی ہیں۔

”علامہ اقبال نے تحریک مرزائیت کے مالمہ و مالمیہ کا مطالعہ کر کے اس کا تجزیہ
 کیا اور مرزائیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت دینے کے مجوز بنے۔ ان کے مرزائیت
 سے متعلق افکار بلاشبہ حرف آخر ہیں۔ علامہ اقبال کی ہمنوائی میں لاہور ہائی کورٹ کے
 ایک ریٹائرڈ جج مرزا اسد ظفر علی نے بھی دلائل سے ثابت کیا کہ قومیں نبوتوں کی بنا پر
 معرض وجود میں آتی ہیں اور الگ الگ شمار ہوتی ہیں۔ علامہ کے الفاظ میں مرزائیت نہ

صرف مسلمانوں کی وحدت کے لئے خطرہ ہے بلکہ اپنے اندر یہودیت کی خصوصیت رکھتی ہے۔ مرزا غلام احمد کی نبوت کا وظیفہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کے حق میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے کہا نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ختم نبوت کے عقیدے کی پوری طرح سمجھ نہیں اور نہ ہی ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور کیا گیا ہے۔ مغربیت کی ہوائے ان مسلمانوں کو فقط نفس کے جذبے سے ہی عاری کر دیا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ ۱۷۹۹ء میں شروع ہوئی، اس کی روشنی میں مرزائیت کے اصل منروف سمجھے جاسکتے ہیں۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں یہ سال بے حد اہم ہے۔ اس سال ٹیپو کو شکست ہوئی۔ اسی سال ”جنگ نواریو“ وقوع پذیر ہوئی جس میں ترکی کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ سلطان ٹیپو کے مزار پر درج تاریخ شہادت اور مغربی شہنشاہیت کی ایشیا میں آمد کے بعد اسلامی ہندوستان میں چند اہم سوال پیدا ہو گئے ہیں۔ ”کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟ ہندوستانی مسلمان اور وہ مسلمان جو ترکی سے باہر ہیں، ترکی کی خلافت سے کیا تعلق رکھتے ہیں؟

ہندوستان دارالحرب ہے۔ اسلام میں نظریہ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ قرآن کی آیت ”اولی الامر منکم“ میں منکم کا مفہوم کیا ہے؟ احادیث میں مہدی کے ورود کی پیشین گوئی کیا نوعیت رکھتی ہے؟ اسی قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بداهتاً ”صرف ہندوستانی مسلمانوں سے تھا اور سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا افسوسناک باب ہیں۔

چونکہ مسلمانوں کو صرف ایک چیز ہی قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربانی سند ہے۔ لہذا غیر ملکی شہنشاہیت کی خدمت گزاری کے لیے ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی، جسے مرزائیت نے فراہم کیا۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکر میں مرزائیت کا وظیفہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کے حق میں الہامی بنیاد فراہم کرنا تھا۔ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں جہاں دیگر اقطاع ہند کے مقابلے میں پیر پرستی زیادہ مسلط ہے، تحریک مرزائیت سیاسی دینیات کا درجہ رکھتی ہے، بالخصوص پنجاب میں مبسم دینیاتی عقائد کا

فرسودہ حل اس سادہ لوح دہقان کو آسانی سے مسخر کر لیتا ہے جو صدیوں سے ظلم و ستم کا شکار ہے۔ غرض مرزائیت دوسرے اسباب کے علاوہ لوگوں کے روحانی افلاس کی پیداوار ہے۔

علامہؒ فرماتے ہیں میں کسی مذہبی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا نہ مرزائیت کے بانی ہی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ پہلی چیز عام مسلمانوں کے لئے کچھ دلچسپی نہیں رکھتی اور دوسری کے لئے لوگوں میں ابھی شعور نہیں آیا۔ مسلمان ان تحریکوں کے مقابلے میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لئے خطرناک ہوں چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہوں لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور بزم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لئے خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لئے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔

انسانیت کی تمدنی تاریخ میں ختم نبوت کا تحیل غالباً سب سے انوکھا تحیل ہے جس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے موبدانہ تمدن کی تاریخ سے ہی ہو سکتا ہے۔ ”بہائیت“ قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے مگر باطنی طور پر اسلام کی روح اور عقائد کے لئے مسلک ہے۔ قادیانی جماعت کی ختم نبوت کے متعلق تمام تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ اس کا شمار حلقہ اسلام میں ہو تاکہ اسے سیاسی فوائد حاصل ہو سکیں۔ ”ختم نبوت“ ایک سیاسی اور اجتماعی مگر مکمل اور اسلامی تنظیم ہے جیسے عرفاً اسلام کہتے ہیں۔ محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ مرزائیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریک مرزائیت کا بانی ایسے ہی الہام کا حامل تھا۔ لہذا وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔

علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں جب بانی مرزائیت کی نفسیات کا مطالعہ اس

کے دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبر اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف نبی یعنی تحریک مرزائیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کرتا ہے اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم النسین پر متصرف ہو جاتا ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے اس قول پر کہ ”ایک مسلمان ولی کے لیے اپنے روحانی ارتقاء کے دوران اس قسم کا تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے، جو شعور نبوت سے مختص ہو۔“

علامہؒ فرماتے ہیں کہ اگر شیخ کو اپنے کشف میں یہ نظر آ جاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی جنہیں تصوف کا شوق ہے، ان کی صوفیانہ نفسیات کے پردے میں پیغمبر اسلام کی ختم المرسلین سے انکار کر دیں گے تو وہ یقیناً ”علمائے ہند سے بھی پہلے مسلمانان عالم کو ایسے غداران اسلام سے متنبہ کر دیتے۔ جب کسی قوم کی زندگی کا انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط ہی الہام کا ماخذ بن جاتا ہے۔ ان لوگوں کی قوت ارادی پر غور کرو جنہیں اسلام کی بنیاد پر تلقین کی جاتی ہے کہ ایسے ماحول کو اٹل سمجھو۔ بس میرے خیال میں یہ وہ تمام ایکٹر جنہوں نے مرزائیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے، زوال اور انحطاط کے ہاتھوں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ علامہؒ فرماتے ہیں۔ قادیانی اور نسو مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے دل میں مسلمانان ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ قادیانی بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی بیداری سے سخت مضطرب ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانان ہندوستان کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے ان کا مقصد فوت ہو جائے گا کہ پیغمبر عرب کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت پیدا کریں۔

علامہ صاحب فرماتے ہیں۔ مرزائیت اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے لیکن اس قوت ارادی کو فنا کر دیتی ہے جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ میں نے تحریک مرزائیت کے ایک رکن کو خود اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے ہوئے سنا۔ سیاسی نقطہ نظر سے وحدت اسلامی اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب

اسلامی ریاستیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی نقطہ نظر سے اس وقت، جب مسلمان بنیادی عقائد یا ارکان شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا، صرف اسلام کے دائرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی جاسکتی ہے اور بس یہ وہ حقائق ہیں جن سے مرزائیت کو سب سے پہلے کافر مذہب علامہ اقبال نے قرار دیا اور انہوں نے اپنے مطالعہ سے مرزا قادیانی کو خدا کا باغی، دین کا قاتل اور رسول اللہ ﷺ کا دشمن قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ مرزائیوں کو علامہ سے خاص بغض تھا۔

میں نے کئی مرزائیوں سے سنا کہ اگر علامہ اقبالؒ اور شورش کشمیری مرزائی ہوتے تو مرزائیت کو کوئی خطرہ نہیں تھا، وہ دنوں میں پھلتی پھولتی اور دنیا پر اپنا تسلط قائم کر لیتی۔ یہاں اس امر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرزائی امت کو اپنے جھوٹے نبی کی تصدیق کے لیے علامہ اقبالؒ اور شورش کشمیری جیسے عاشقان رسول ﷺ کی کتنی ضرورت تھی۔ دردغ برگردن راوی اکثر مرزائی علامہ اقبالؒ پر الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ پہلے مرزائی تھے اور بعد میں انہوں نے اس مذہب کو چھوڑ دیا حالانکہ علامہ اقبالؒ کی بالغ نظری کو جدید و قدیم کی اس چپقلش کا تازیست احساس رہا۔ انہوں نے مرزائیوں کے مسئلہ پر جو مضامین لکھے ان میں کئی جگہ عقیدے کو اپنے ناخن فکر سے کھولا۔ یہی وہ عوامل ہیں جو مرزائی نبی اور اس کے برگ و بار خلفاء اور امت کو علامہ صاحب کی ذات کے خلاف زہر اگلنے پر مجبور کرتے رہے۔

بھارتی روز نامے ”سٹیشن مین دہلی“ کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ علامہ انگریزوں کو کھلے خطوط تحریر کرتے رہے جن میں قادیانیوں اور مسلمانوں کی نزاع کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کیا گیا۔

ہم لوگ جب ایف۔ اے میں پڑھتے تھے تو ہمارے نصاب میں علامہ اقبالؒ کا یہ کلام شامل تھا۔

کبھی اے حقیقت مختصر، نظر آ لباس مجاز میں
 کہ ہزاروں جدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں
 طرب آشنائے خوش ہو، تو نوا ہے محرم گوش ہو
 وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردہ ساز میں
 تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
 کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں
 دم طوف کرک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کس
 نہ تری حکایت سوز میں نہ میری حدیث گداز میں
 نہ کہیں جہاں میں اہل ملی، جو اہل ملی تو کہیں ملی
 مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں
 نہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
 نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
 جو میں سرسبدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
 تیرا دل تو ہے صنم آشنا! تجھے کیا ملے گا نماز میں

ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی نے یہ کلام پڑھاتے ہوئے زہرا گلا کہ علامہ کی اس
 نظم کا توڑ مرزا غلام احمد کی بیٹی نواب مبارکہ بیگم نے اپنی کتاب ”در عدن“ میں کر دیا
 ہے جس کا مطالعہ کر کے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوفہ کی فکر علامہ اقبال سے
 کتنی بلند ہے۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کہاں ”راجہ بھون کہیں گنگو تیلی“
 یہ شخص ایک عظیم انسان کو کس ”جنس کاسد“ کے ساتھ ملا رہا ہے۔ نواب مبارکہ
 بیگم کا کلام ملاحظہ ہو۔

مجھے دیکھ طالب مختصر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
 جو خلوص دل کی رمت بھی ہے ترے ادعائے نیاز میں
 تیرے دل میں میرا ظہور ہے، تیرا سر ہی خود سر طور ہے

تیری آنکھ میں میرا نور ہے، مجھے کون کتا ہے دور ہے
 مجھے دیکھتا جو تو نہیں تو یہ تیری نظر کا قصور ہے
 مجھے دیکھ طالب مختصر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
 کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
 مجھے دیکھ رفعت کوہ میں مجھے دیکھ پستی کاہ میں
 مجھے دیکھ عجز فقیر میں، مجھے دیکھ شوکت شاہ میں
 نہ دکھائی دوں تو یہ فکر کر کہیں فرق ہو نہ نگاہ میں
 مجھے دیکھ طالب مختصر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
 کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
 کبھی بلبلوں کی صدا میں سن کبھی دیکھ گل کے نکھار میں
 میری ایک شان خزاں میں ہے میری ایک شان بہار میں
 مجھے دیکھ طالب مختصر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
 کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
 میرا نور شکل ہلال میں میرا حسن بدر کمال میں
 کبھی دیکھ طرز جمال میں کبھی دیکھ شان جلال میں
 رگ جاں سے ہوں میں قریب تر، تیرا دل ہے کس کے خیال میں
 مجھے دیکھ طالب مختصر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
 کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں

مرزائی امت اس بات کی شدت سے خواہش مند تھی کہ وہ حضرت علامہ اقبال
 کے مد مقابل کے طور پر اپنے ہاں کوئی ایسی شخصیت سامنے لائے لیکن ان احمقوں کو یہ
 معلوم نہیں کہ دانائے راز صدیوں میں آتا ہے جس کا مقابلہ مرزا غلام احمد جیسے مسلمہ
 کذاب نہیں کر سکتے۔ اکثر مرزائی کلاس فیلو یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ ان کے نبی کے
 فیض کے اثر سے سب سے زیادہ مرزائی شہر اقبال سیالکوٹ میں ہوئے ہیں۔ قصہ مختصر

مرزائیوں نے مرزا غلام احمد کی شان بلند کرنے کے لئے جس طرح کئی پاؤں پیلے، اسی طرح علامہ کے مرتبہ کو کم کرنے کے لئے بے شمار حربے استعمال کیے، لیکن نہ وہ اپنے ”نبی“ کا مقام بلند کر سکے نہ علامہ کی شان گھٹا سکے۔

اسی طرح ہمارے سکول میں ایک مرزائی شاعر صوفی علی محمد کا بیٹا اعجاز اکبر اکثر دو قصے ”علی دا ملنگ“ اور ”مہدی دا ملنگ“ سنایا کرتا تھا۔ پہلے قصے میں علی کے ملنگ کی انتہائی تضحیک اور اہانت کی جاتی تھی جبکہ دوسرے میں مہدی کے ملنگ کو ایک عظیم مرتبے پر فائز دکھایا جاتا تھا۔ یہ قصہ شہر میں اکثر صوفی علی محمد کے بیٹے یوں پڑھتے ہوئے نظر آتے تھے جیسے بھیک مانگنے والے فقیر منظوم قصے گا کر خیرات طلب کرتے ہیں۔

یہاں سیلاب نہیں، آسمانی عذاب آئے گا

۱۹۶۹ء میں اہاجی کا تہلولہ ہوا تو ہم چنیوٹ آ گئے۔ میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ تاہم تعلیمی سلسلہ ربوہ میں ہی برقرار رہا۔ ۱۹۷۰ء میں میٹرک پاس کر کے تعلیم الاسلام کلج میں داخلہ لے لیا۔ قاضی اسلم اگرچہ کلج کے پرنسپل تھے۔ مگر عملاً ”کلج پر حکمرانی وائس پرنسپل صوفی بشارت الرحمن کی تھی۔ ان کی سخت گیری کے باعث انہیں تمام طلبہ ”صوفی مصیبت الرحمن“ کہا کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ ربوہ کی الفضل والی جس گلی میں ہم مقیم رہے اسی میں صوفی بشارت کا بھی گھر تھا۔ تعصب اور صوفی بشارت ایک چیز کے دو نام تھے۔ اہاجی کی ربوہ میں مقبولیت اور لوگوں کی ان سے عقیدت صوفی بشارت کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ چنانچہ کلج میرے داخل کے سلسلے میں صوفی بشارت نے بہت روڑے اٹکائے مگر ہمیشہ کی طرح انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم لوگ چنیوٹ سے صبح کے وقت لاہور سے سرگودھا آنے والی ریل کار پر ربوہ آتے اور دوپہر کے وقت فیصل آباد جانے والی پینجر ٹرین پر واپس چنیوٹ جلیا کرتے تھے۔

کلج کا ماحول بھی بالکل تعلیم الاسلام ہائی سکول جیسا تھا۔ یہاں بھی مذہبی حوالے سے مرزائی اجارہ داری تھی۔ فصلی مضامین کے علاوہ ایک اضافی مضمون ”تھیالوجی“ ہر طالب علم پر پڑھنا لازم تھا اور مرزائی کتب پر مشتمل تھا۔ کلج کے یونیفارم میں ”موٹی“ کالی ٹوپی اور سیاہ انڈر گریجویٹ گاؤن شامل تھا۔ کلج کے تمام اساتذہ بظاہر خوش مزاج مگر تعصب کے ”پرکالے“ تھے۔ ہمیں اردو ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی پڑھایا کرتے تھے۔ وہ اپنے پیڑھ میں کسی نہ کسی بہانے مرزائیت کا پرچار جاری رکھا کرتے تھے۔ انہیں کلج کی طرف سے آفس کے لئے جو کمرہ دیا گیا تھا وہ درحقیقت ایک ”کشلوہ غسل خانہ“ تھا چنانچہ جب بھی کسی لڑکے کو کمرے میں بلانا مقصود ہوتا تو وہ

کہتے ”ارے میاں ذرا میرے غسل خانے میں آ جانا۔“

جو لڑکے کمرے کی حقیقت سے واقف تھے انہیں تو کوئی حیرت نہ ہوتی لیکن نئے لڑکے ایک مرتبہ تو گھبرا جاتے۔ ان کی گھبراہٹ اپنی جگہ بجا ہوتی کیونکہ ربوہ کے اساتذہ کی اکثریت ”گے کلچر“ کی خوگر تھی۔ کلاس میں پروازی صاحب اکثر لڑکوں سے پوچھا کرتے بھی! آپ نے کبھی عشق فرمایا ہے؟ لڑکے بھی جواباً پوچھتے ”سر! آپ نے کبھی فرمایا ہے؟ اس پر پروازی صاحب کہتے میں نے عشق فرمایا نہیں کیا ہے۔ اور جن سے کیا وہ میری اہلیہ ہیں۔“ ہمارے ایک کلاس فیلو نعیم شلہ سے انہوں نے پوچھا کیا تم نے کبھی عشق فرمایا ہے؟ ”کماجی“ پوچھا ”کس کے ساتھ؟“ نعیم شلہ نے کہا جناب محلے کی ایک لڑکی کے ساتھ۔ اس پر پروازی صاحب فرمانے لگے بھی دیکھ لینا کہیں وہ لڑکا نہ ہو اور تمہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“

صوفی بشارت ایم اے عربی کی کلاسیں لیا کرتے تھے۔ جن میں لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ کلاس روم کے وسط میں ایک بڑا سا پردہ لگا دیا گیا تھا جس کے دوسری طرف لڑکے ہوتے تھے۔ درمیان میں یعنی دونوں اصناف کے سامنے صوفی صاحب براجمان ہوتے تھے۔ ان پر لڑکیوں کے روئے جمل دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی تاہم لڑکوں کے لئے ان کی ہم جماعت لڑکیاں شجر ممنوعہ تھیں جن کی طرف دیکھنا زنداں میں جانے کے مترادف تھا۔ ایک مرتبہ ایک لڑکا اپنے لمبے قد کی وجہ سے دھر لیا گیا۔ موصوف ایم اے عربی کا طالب علم تھا اس کا ”لمبا قد“ کمرے میں معلق پردے سے اونچا تھا۔ وہ کلاس میں کھڑا تھا کہ اس دوران صوفی بشارت کلاس میں وارد ہوئے انہوں نے سمجھا لڑکا پردے کے اس پار کسی ”پری“ کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بس پھر کیا تھا قر بشارت عود کر دیا اور اس طالب علم کو کالج سے بے جرم نکل دیا گیا۔ ربوہ میں یہ بات عام تھی کہ صوفی بشارت اولاد جیسی نعمت سے محروم ہونے کے باعث اپنی محرومیوں کا حساب طلباء سے لیتے تھے۔ عربی کی طالبات میں سے ایک حسن و جمل کی پر تو اپنے ایک ہم جماعت پر فریفتہ ہو گئی لیکن اس طالب علم نے اپنے کالج بدر ہم جماعت کا حوالہ

دے کر ہاتھ جوڑتے ہوئے موصوفہ سے کہا ”اے دشمن عقل و آگہی! مجھے معاف ہی کرو مجھ میں قبر بشارت برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔“

اسلامیات کے پروفیسر عثمان صدیقی، جنہیں بھلہری کے داغوں کے باعث ”بابا عالم سرخ پوش“ کہا جاتا تھا گو مرزائی تھے مگر ان میں دیگر مرزائیوں جیسا حوصلہ نہیں تھا۔ ایک بار وہ سورہ یوسف پڑھا رہے تھے تو انہوں نے حضرت یوسف اور زلیخا کے بارے میں کچھ خرافات بیان کرنے کی کوشش کی جس پر میرے سمیت چند مسلمان طلبہ نے ان سے برملا کہا ”جناب آپ نصیبی کتب پڑھا رہے ہیں لہذا ان میں ”اپنی جماعت“ داخل نہ کریں ورنہ ہم کلاس کا بائیکاٹ کر دیں گے۔“ بس اتنی بات کہنے کی دیر تھی، صدیقی صاحب سیدھے ہو گئے۔

کلج کے تمام اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بہت کم تنخواہ ملا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں جب تعلیمی ادارے قومیائے گئے تو تمام اساتذہ کی چاندی ہو گئی۔ اکثریت کو برسوں کے بقایا جلت ملے تو انہوں نے گاڑیاں لے لیں۔

کلج میں یہ قاعدہ تھا کہ ہر سال یونین کے الیکشن کرائے بغیر صدر اور سیکرٹری سمیت تمام عہدیدار پر نپہل اپنی مرضی سے منتخب کر دیا کرتے تھے۔ تعلیمی ادارے سرکاری تحویل میں جانے کے بعد ہمارے ایک سینئر طالب علم رفیق باجوہ نے اس فرسودہ روایت کو توڑنے کی کوشش کی اور یونین کا الیکشن باقاعدہ لڑنے کی مہم چلائی۔ اس وقت کلج کے پر نپہل چودھری محمد علی جبکہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک معراج خالد تھے۔ کلج انتظامیہ نے رفیق باجوہ کو الیکشن لڑنے سے روک دیا اور حکم عدولی کی صورت میں کلج سے تین سال کے لئے نکال دینے کی دھمکی دی۔ مگر رفیق باجوہ ڈٹ گیا اور اس نے وزیر اعلیٰ ملک معراج خالد سے ملاقات کر کے پر نپہل چودھری محمد علی کے نام ایک حکم جاری کروایا جس میں یونین کے انتخابات صوبے کے کالجوں میں مروجہ طریق کار کے مطابق کرانے کے لئے کہا گیا۔ لیکن یہ حکم نامہ جب پر نپہل صاحب کو ملا تو اس نے یہ کہہ کر تار تار کر دیا ”ملک معراج خالد پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہوں گے“

ربوہ کے نہیں۔ اس کلج پر ان کا نہیں، میرا حکم چلتا ہے۔“

رفیق باجوہ اور اس کے ساتھیوں ظہیر چٹھہ اور انور دیو نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو پرنسپل نے مرزا طاہر اور مرزا لقمان سے مدد طلب کر لی۔ خدام احمدیہ کے غنڈوں نے کلج گھیرے میں لے کر تینوں طلبہ کو پکڑنے کے لئے کلج کا کونا کونڈا کھلا۔ رفیق باجوہ تو کسی طرح چنیوٹ پہنچ کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا جب کہ ظہیر چٹھہ اور انور دیو پکڑے گئے، جن پر اتنا تشدد کیا گیا کہ انہوں نے دوبارہ الیکشن لڑنے کا مطالبہ نہیں کیا۔ رفیق باجوہ نے بعد ازاں مرزائیت اور ربوہ چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا اور چونڈہ میں رہائش اختیار کر لی۔

پرنسپل چودھری محمد علی عجیب و غریب مزاج کے انسان تھے۔ مرزائیوں والی روایتی مکاری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ طلبہ کو پوری طرح پریشرائز کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ مگر جو نہی کوئی طالب علم حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیتا موصوف بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتے تھے۔ ایسے میں عموماً ان کا ایک ہی مخصوص جملہ ہوتا جن سے طلبہ تسلیج جایا کرتے تھے۔ موصوف روتے ہوئے کہتے ”اچھا تو آج ایک باپ اپنی اولاد کے سامنے اس قدر بے بس ہو گیا ہے کہ اس کے آنسوؤں کی کوئی وقعت نہیں۔“ ایک استاد کو یوں روتا ہوا دیکھ کر سرکش طلبہ بھی موم ہو جاتے تھے۔

۱۹۷۳ء میں چنیوٹ میں شدید سیلاب آیا، اس سال میں نے تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا۔ ہمارے مرزائی کلاس فیلو اور بے تکلف دوست سیلاب کے حوالے سے ہمیں مذاق کرتے ہوئے کہتے کہ ”دیکھ لو پورے ملک میں سیلاب آیا لیکن ربوہ خشک رہا ہے۔ اب بھی احمدیت کو مان لو اچھے رہو گے ورنہ ایک دن ایسا ہی کوئی سیلاب تم لوگوں کو لے ڈوبے گا۔“ ہم نے بھی ان کے لئے منہ توڑ اور شافی جواب تلاش کر رکھا تھا چنانچہ انہیں کہا گیا۔

”بھئی تم سچ کہتے ہو دو مقلات پر واقعی سیلاب نہیں آیا۔“

ان کے کل کھڑے ہو گئے انہوں نے پوچھا ”کون سی دو جگہیں“ ہم نے کہا ”ایک ربوہ اور دوسرا لاہور کا بازار حسن“ ان دونوں مقامات پر کوئی آسپلی عذاب ہی آئے تو آئے سیلاب ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

یہ جواب سنتے ہی اچھے اچھوں کی بولتی بند ہو گئی، وہ روایتی مرزائی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہنے لگے ”یہ جو بات تم نے کہی ہے یہ انسانیت سے گری ہوئی ہے۔ تم نے ہمارے مرکز کو ”قبحہ خانے“ سے ملا دیا ہے۔“

ہم نے جواب دیا ”بھئی بات انسانیت کی ہے تو بازار حسن کے باسی بھی انسان ہیں بلکہ تم لوگوں سے ہزار درجہ بہتر، کیونکہ انہوں نے جھوٹا نبی تو نہیں بنایا۔“

میں ۱۹۷۴ء میں فورتحہ ایئر میں تھا۔ اسی سال ۲۹ مئی کا واقعہ ہوا جس کے نتیجے میں مرزائی سرکاری اور آئینی طور پر کافر قرار دیئے گئے۔ اس واقع کی تفصیلات مرزا طاہر کے متعلق باب میں آچکی ہیں۔ تاہم کچھ باتیں بیان کرنی ناگزیر ہیں کہ ۲۹ مئی سے ۷ ستمبر تک چنیوٹ سے ربوہ پڑھنے کے لئے آنے والے ہم جیسے طلبہ و طالبات کو بھی بہت بڑی قربانیاں دینا پڑیں۔ ان دنوں ربوہ میں ریل اور بس نہیں ٹھہرتی تھی۔ چنانچہ ہم سب دریائے چناب کے پل پر اترتے اور وہاں سے پیدل کلج آیا کرتے تھے۔ ہم نے ”شینزان“ کا باقاعدہ بائیکاٹ کیا۔ ایک بار کسی مسئلے پر پرنسپل صاحب نے ہمیں اپنے آفس بلایا وہاں ہمیں شینزان پیش کی گئی مگر تمام طلبہ نے اجتماعی طور پر شینزان پینے سے انکار کر دیا۔ حکومتی فیصلہ آنے تک ہم سب نے اپنے مرزائی دوستوں اور کلاسوں سے بھی ترک تعلق کیے رکھا۔ ۷ ستمبر کو جب قومی اسمبلی میں مرزائیوں کو کافر قرار دینے کا قانون پاس کر کے ۹۰ سالہ پرانا ختم نبوت کا مسئلہ حل ہوا تو ہم لوگ فاتح بن کر ربوہ داخل ہوئے۔

اس سال ہم نے یونین کا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ مرزائی انتظامیہ نے مختلف طریقوں سے ہمیں الیکشن میں حصہ لینے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مسلمان طلبہ میں پھوٹ اور انتشار ڈالنے کی سازشیں کی گئیں۔ ہم لوگوں نے یہ یقین ہونے کے باوجود

کہ کلج میں مسلمان طلبہ کی تعداد کم ہے اور جیت ممکن نہیں، الیکشن لڑنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ مرزائی ہم لوگوں سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ انہیں ربوہ میں کوئی موزوں طالب علم امیدوار نہیں مل رہا تھا جو ہمارا مقابلہ کرتا۔ پشاور سے ایک مرزائی طالب علم اعجاز خان یوسف زئی کو مائیگیٹ کرا کے ربوہ لایا گیا جب کہ ہمارا امیدوار منیر احمد تبسم تھا۔ کلج میں پہلی بار انتخابی سرگرمیاں کھل کر ہوئیں۔ اس دوران ہم نے ایک مزاحیہ سانعوہ تیار کیا جس کا کوئی مطلب تھا نہ مفہوم۔ ہم میں سے ایک لڑکا بلند آواز سے کہتا ”لائٹ آن کیمرہ ڈاؤن ایک دو تین لوٹے“ اس بے معنی نعرے سے مرزائی طلبہ اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ ان کے مرکز میں بھی سر جوڑے جانے لگے کہ یہ کسی سازش کا کوئی کوڈ یا خفیہ سگنل نہ ہو۔ شہر کی دیواروں پر امیدواروں کے ناموں کی تشیر کی گئی۔ کلج میں بینر لگائے گئے۔ کلج انتظامیہ نے ضلعی اور تحصیل انتظامیہ سے درخواست کی کہ وہ الیکشن اپنی نگرانی میں کرائے۔ اس مقصد کے لئے ربوہ کے مجسٹریٹ سردار منیر احمد لغاری کو خصوصی ٹاسک دیا گیا۔ مرزائیوں نے لغاری کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے کلج کے گیسٹ ہاؤس میں رہائش فراہم کر دی۔ الیکشن والے دن ضلع بھر کی انتظامیہ ربوہ پہنچ گئی۔ ڈپٹی کمشنر کی نگرانی میں خصوصی بیلٹ پیپر کے ذریعے الیکشن ہوئے۔ حسب توقع مرزائی جیت گئے۔ بعد میں اس خوف سے کہ ہم کوئی مظاہرہ نہ کریں انتظامیہ نے ہم سے تحریری ضمانت لی۔ یونین کے الیکشن ہارنے کے باوجود ہم نے کلج کی مختلف سوسائٹیوں کے الیکشن میں بھی حصہ لیا۔ میں نے ہسٹری سوسائٹی کے صدر کا انتخاب بلا مقابلہ جیتا۔ یونین کے الیکشن کی ہار کا حساب بھی ہم سے بعد آنے والی فورتحہ ایئر نے ۱۹۷۵ء میں چکا دیا۔ اس سال پر نپل سمیت بیشتر مرزائی اساتذہ تبدیل ہو چکے تھے۔ دوسرے مسلمان طلبہ نے یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ مسلمان ہیں الیکشن میں حصہ لیا۔ مگر جیتنے کے فوراً بعد انقلاب برپا کر دیا۔ کلج میں دیگر تعلیمی اداروں کی طرح اتوار کی چھٹی کرائی گئی۔ کلج کے ہال اور دیگر مقامات سے مرزائی اکابرین کی تصاویر اتوا کر قائد اعظم، علامہ اقبال اور ذوالفقار علی بھٹو کی تصاویر لگوائی گئیں۔ جلسہ

سلانہ پر کلج مرزائیوں کے تصرف میں دینے کی پرانی روش ختم کرا دی گئی۔ یونہی کے مسلمان صدر ملک ظہیر اعوان برلا کہا کرتے تھے کہ ”ہم نے اپنے پیش رو مسلمان طلبہ بھائیوں کی سالہا سال کی کوششوں کا ثمر پایا ہے۔“

کلج میں کیمسٹری کے پروفیسر سید سلطان محمود شاہد واحد استاد تھے، جن کی مسلمان طلبہ سے بہت بنتی تھی۔ چنانچہ جب بھی کوئی ”پھڑا“ پڑتا موصوف کو ”پل“ بننے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ایم ایم احمد کے بھائی مرزا مجید احمد موجی ہسٹری کے استاد تھے۔ مگر اہل بیت کے اس قدر مخالف تھے کہ کلاس میں شیعہ طلباء کا وجود ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ جب کہ سعود احمد خان انتہائی غصیلے اور روایتی قسم کے مرزائی تھے۔

فضل عمر ہوٹل میں ہر قسم کی شراب ملتی تھی۔ کوئی مرزائی لڑکا مے نوشی کرتا ہوا پکڑا جاتا تو معاملہ دبا دیا جاتا مگر جب کوئی مسلمان لڑکا گرفت میں آ جاتا تو اس کی باقاعدہ تشہیر کی جاتی اور اسے کلج سے نکل دیا جاتا ایک بار ہمارے ایک دوست شاہد نسیم پر بھی شراب نوشی کا الزام لگایا گیا۔ اس سے قطع نظر وہ قصور وار تھا یا نہیں، اس کو باقاعدہ سزا دی گئی اور کلج چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔

ہمارا دوست قمر الزمان فاروقی مسلمان طلبہ میں زبردست قسم کا مرد مجاہد تھا۔ تھیالوجی کے استاد اسلم منگلا کے ساتھ ایک بار اس نے ایسی نکرلی کہ منگلا سمیت پوری کلج انتظامیہ کے چھکے چھڑا دیئے۔ اسلم منگلا قرآن پاک کی تفسیر پڑھا رہا تھے۔ انہوں نے حسب عادت مرزائی خلیفہ مرزا محمود کا ترجمہ پڑھانا شروع کر دیا۔ قمر الزماں نے کھڑے ہو کر کہا۔

”سرا! قرآن مجید کا جو ترجمہ آپ کر رہے ہیں وہ غلط ہے۔“ اسلم منگلا نے قمر کو بیٹھ جانے کے لئے کہا مگر اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک غیر مسلم شخص کو قرآن کا غلط ترجمہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

اسلم منگلا کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ انہوں نے کلاس چھوڑ دی اور شکایت کرنے چودھری محمد علی کے پاس جا پہنچے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مرزائی کافر قرار دیئے جا چکے تھے اور ربوہ کھلا شہر بن چکا تھا۔ پرنسپل نے فوری طور پر قمر کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا اور کہا۔

”قمر! تم نے اسلم منگلا سے گستاخی کی ہے لہذا معافی مانگو۔“

قمر نے کہا ”گستاخی میں نے نہیں اسلم منگلا نے کی ہے“ قرآن پاک کے معافی تبدیل کرنے کے جرم پر وہ معافی مانگیں۔“

چودھری محمد علی نے یہ جواب سنا تو گرجدار آواز میں کہا ”لو کے اپنی آواز بند کرو، تمہیں معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔“

قمر نے کہا ”سر! آپ میری آواز بند نہیں کر سکتے، ہماری آواز کی گرج آپ سے کہیں زیادہ ہے اور اس گرج سے عورتوں کے حمل گر جایا کرتے ہیں۔ بطور استاد اسلم منگلا کا احترام لازم سہی لیکن قرآن پاک کا غلط ترجمہ کرنے والا کسی احترام کا مستحق نہیں۔“

چودھری محمد علی صاحب غصے سے کانپ رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی تھی، کچھ دیر بعد انہوں نے قمر کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں تمہیں کالج سے تین سال کے لیے نکال سکتا ہوں۔ اگر ایسا کر دیا گیا تو تمہیں کسی کالج میں داخلہ نہیں مل سکے گا۔“ قمر نے پھر بھرپور وار کیا اور کہا ”سر! ہم مسلمان اور قرآن کے محافظ ہیں اگر کسی نے اس کے الفاظ و معانی میں کوئی تحریف کی تو ہم اس کی کھل اتار سکتے ہیں۔ آپ کو بھی شاید اس بات کا علم نہیں۔“ پرنسپل کے کمرے میں موجود دیگر اساتذہ نے قمر کو چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ اور بھڑک اٹھا اور کہا:

”پرنسپل صاحب! آپ اگر مجھے اس مقدس جرم کی پاداش میں کالج بدر کر دیں گے تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔ لیکن یاد رکھیں، اگر آپ کے کسی استاد نے قرآن

حکیم کے ترجمے میں کوئی تبدیلی کی تو میں آپ سمیت سب کو الٹا لٹکا دوں گا۔ آپ کو اپنے ”نبی“ کی نبوت، سنت اور تفاسیر پر بڑا مان ہے تو ہم بھی اپنے پیارے کل کی کلی والے (مظلوم) کے غلام ہیں، ہمیں روہانی نہیں آتی۔“

پرنسپل اور اسلم منگلا دونوں چپ تھے انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ قدرے توقف کے بعد فون اٹھاتے ہوئے پرنسپل نے کہا۔

”میں پولیس کو بلاتا ہوں تاکہ وہ اس نعرے باز لڑکے کو جیل میں بند کرے۔“
 قمر پھر گر جا اور کہا ”بے شک بلا لیں پولیس کو، دیکھتے ہیں سلاخوں کے پیچھے کون جاتا ہے میں یا آپ۔“

اب جبکہ کوئی بات کار ثابت نہ ہوئی تو پرنسپل نے ایس ایم شاہد کو بلوایا کہ وہ قمر کو سمجھائیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ایس ایم شاہد ہمیشہ پل کا کردار ادا کرتے تھے انہوں نے قمر کو یقین دلایا کہ آئندہ کلاس میں مرزائی تفاسیر سے کوئی ترجمہ نہیں کیا جائے گا۔ تب جا کر معاملہ ٹھنڈا ہوا۔

قمر انہیں ہمارے دوستوں میں سب سے زیادہ نڈر اور دلیر تھا۔ اس نے شورش کشمیری کی تحریر اور تقاریر پڑھ اور سن رکھی تھیں وہ اسی انداز میں مرزائیوں کے ”لئے“ لیا کرتا تھا۔ اس نے ذاتی مصروفیات کی بنا پر یونین کے الیکشن میں حصہ نہیں لیا ورنہ مرزائیوں کی عقل ٹھکانے لگ جاتی۔ یونین کے الیکشن کے دوران مرزائیوں کو یہ دھڑکا ہی لگا رہا کہ قمر انہیں کہیں مسلمان طلبہ کا امیدوار نہ بن جائے۔

کلج میں ہم نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی جس میں چنیوٹ کے علاوہ ہوسٹل میں مقیم تمام لڑکے شامل تھے۔ اس سوسائٹی کی غرض و غایت کلج میں مسلمان لڑکوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام اور مرزائی اساتذہ اور طلبہ کی ان باتوں پر نکتہ چینی کرنا تھی جو خلاف اسلام تھیں۔ مرزائیوں کا زور توڑنے کے لئے ہم نے اس سوسائٹی کے زیر اہتمام اعلیٰ حکام سے ملاقاتیں کیں۔ پنجاب کے ایک وزیر اعلیٰ سے ہماری ملاقات بھی ہوئی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی اہلیہ

مرزائی تھیں۔ مرزائی ہماری اس سوسائٹی سے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لئے اپنی خفیہ ایجنسیاں سرگرم کر دیں۔

سرگودھا کا ایک شخص خالد محمود اکثر و بیشتر ربوہ آتا اور وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا کہ وہ حکومت اور غیر ملکی ایجنسیوں کی طرف سے مرزائیوں کے خلاف معلومات لینے پر مامور ہے چنانچہ اس ”بد ملت“ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اسے ہمارے جیسے طلباء ہی فراہم کر سکتے ہیں۔ اس شخص کی باتوں سے ماتھا تو ہمارا پہلے ہی دن ٹھنکا تھا مگر پھر بھی ہم نے کافی دن خاموشی سے کام لیا۔ ایک دن اس نے ہمیں سرگودھا بلایا ہم چھ سلت لڑکوں کا گروپ سرگودھا گیا، ہم نے احتیاطاً ”گورنمنٹ کالج سرگودھا کے ایک دو ”اولڈ طلبہ“ کو بھی ساتھ لے لیا۔ نعمت کدہ ہوٹل میں پر تکلف کھانے کے بعد خیام سینما میں ہمیں قلم دکھائی گئی۔ اس شخص کے موضوع گفتگو میں یہی پہلو نمایاں ہوتا تھا کہ ہم اسے مرزائیوں کے خلاف اپنے منصوبوں سے متعلق معلومات فراہم کریں۔ اس شخص کے بارے میں جلد ہی ہمارے سرگودھا کے دوستوں نے پتہ چلا لیا کہ یہ سیالکوٹ کا رہنے والا ہے اور مرزائیوں کی کسی خفیہ ایجنسی کا نمائندہ ہے، جو مسلمان طلبہ کو اپنا ہم نوا بنا کر ان کے عزائم کا جائزہ لینے کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ربوہ میں جماعت اسلامی تو کوئی تنظیم قائم نہیں کرنا چاہتی۔

دراصل مرزائیوں کو خدشہ تھا کہ ہماری مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جماعت اسلامی کی کوئی ذیلی تنظیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ربوہ کے مرزائی اگر کسی سے ڈرتے ہیں تو وہ جماعت اسلامی ہے۔ بعض لوگ تو طنزاً ”یہ بھی کہتے ہیں کہ مرزائیوں کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ان کے ایک کان میں اذان دیتے ہیں اور دوسرے کان میں یہ بتاتے ہیں کہ جماعت اسلامی سے بچ کر رہنا۔ خالد محمود کے علاوہ ایک شخص جس کا نام اب بھول گیا ہے۔ اس نے بھی مسلمان طلبہ کو شیشے میں اتارنے کی بسیار کوششیں کیں مگر اس کی دال بھی نہ گل سکی۔ مرزائیوں کو کالج کی سطح پر ”ناک آؤٹ“ کرنے کے لئے ہماری مدد جن حلقوں نے کی ان میں چونڈا والے رفیق باجوہ قابل ذکر ہیں۔ ہم انہیں ملنے کے

لئے چونڈہ گئے انہوں نے ہمیں ربوہ کے بعض ایسے لوگوں کے حوالے دیئے جن سے مل کر مرزائیوں کی جڑیں کاٹی جاسکتی تھیں۔ ان لوگوں میں لطیف غزنوی قابل ذکر ہیں۔ یہ شخص اگرچہ مرزائی تھا تاہم اس نے ہمیں اپنی سرگرمیاں موثر بنانے کے لئے کئی راہیں بتائیں۔ کلچ میں کئی کالے قوانین، جن کے ذریعے طلبہ کے گرد گھیرا تنگ کیا جاتا تھا ان کی نشاندہی کی اور ان سے بچاؤ کے گرہنائے۔

ربوہ کے تمام تعلیمی اداروں میں داخلہ لیتے وقت، محکمہ امتحان کا داخلہ بھیجتے وقت اور رول نمبر سلپ کے اجراء کے وقت انتہائی مشکل ٹیسٹ لیے جاتے تھے۔ ان امتحانات کو پاس کرنے والوں کو کلچ میں داخلہ ملتا یا ان کا داخلہ بورڈ اور یونیورسٹی کو بھیجا جاتا۔ اور بعد ازاں اس بنا پر رول نمبر جاری کیا جاتا۔ اس سے مرزائی دواہرے مقاصد حاصل کرتے تھے ایک تو کلچ کی کریم کو محکمہ امتحان میں بھیجنے اور سو فیصد نتائج حاصل کر کے اپنے تعلیمی اداروں کے عمدہ ہونے کا پرچار کرتے، دوسرے ناپسندیدہ طلبہ کو عین وقت پر رول نمبر سے محروم کر کے اس کا سال ضائع کرا دیا کرتے تھے۔ ہم نے اس کالے قانون کو جڑ سے نکال پھینکا۔ طلبہ نے پرنسپل کے ساتھ باقاعدہ ”متھا“ لگا کر داخلہ اور رول نمبر ٹیسٹ دینے سے انکار کر دیا۔ جس سے کئی لڑکوں کا سال ضائع ہونے سے بچ گیا۔

۱۹۷۵ء میں بی۔ اے کا امتحان دینے کے بعد ربوہ سے میرا وہ عملی رابطہ اور واسطہ ختم ہو گیا جو ۱۹۶۵ء میں قائم ہوا تھا۔ تاہم کلچ کو خیر باد کہنے کے بعد بھی ہماری بے شمار یادیں وہاں باقی رہیں جن میں مرزائیوں کے ان کالے قوانین کا خاتمہ شامل ہے جن کی زد میں آکر مسلمان طلبہ کلچ اور ہوسٹل میں درماندہ زندگی گزارا کرتے تھے۔

ان دنوں ربوہ کے درودیوار اور سڑکوں کے سنگ میل پر جرمن نازی ازم کا نشان ”سیواس ٹیکا“ رقم ہوتا تھا۔ اس بارے میں پتہ چلا کہ مرزائیوں کی نازی تنظیم سے بھی وابستگی ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں اخبارات میں شور مچایا تو یہ نشان کسی در پردہ قوت نے صاف کر دیئے۔

قرآن کریم کے لفظ ”ربوہ“ کا تحقیقی مطالعہ

حل ہی میں پنجاب اسمبلی نے ”ربوہ“ کا نام تبدیل کرنے کی ایک قرارداد پاس کی ہے جس پر قادیانی امت کے تمام حالات سے واقف ترجمان راجہ غالب احمد برادر راجہ منور احمد نے بہت کسماتے ہوئے کہا ہے کہ اگر شہروں کے نام تبدیل کرنے کا یہ سلسلہ چل نکلا تو پھر رکے گا نہیں۔ ذیل کا علمی و تحقیقی مضمون اس سلسلے میں قارئین کے لئے مفید اور سودمند ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قادیانی امت نے یہ نام اپنی روایتی تئیس سے کام لیتے ہوئے محض اپنی معاشی اور روحانی دکان چمکانے اور عام مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے رکھا ہے اس لئے اس کا تبدیل کرنا ناگزیر ضرورت ہے۔

نعمہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

بسم اللہ الرحمن الرحیم و بعد

قرآن مجید میں ربوہ کا لفظ دو دفعہ استعمال ہوا ہے۔

(۱) کمثل جنة ربوة (سورہ البقرہ ۲۶۵)

(۲) و آوینا ہما الی ربوة ذات قرار و معین (سورہ المؤمنون ۵)

۱۔ لفظی ترجمہ

جو سطح زمین سے بلند جگہ پر ہو اور دوسری آیت میں ”عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو ایک ٹیلہ پر ٹھکانہ دیا۔ اس لفظ کا اصل مادہ ”ر ب و“ ہے۔ جو کہ قرآن مجید میں مختلف جگہوں میں مختلف شکلوں کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ ان تین حروف کو جب یکجا کریں تو یہ لفظ ”ربوہ“ کی شکل اختیار کر جاتا ہے، جس کا قرآن مجید میں اس

طرح ذکر ہوا ہے

احل اللہ البیع و حرم الربوا (سورہ البقرہ ۲۷۵)

یعنی اللہ نے خرید و فروخت کو جائز کیا ہے جب کہ سود کو حرام کیا ہے۔ یہ دراصل ہر زیادتی کا نام ہے۔ پھر اس زیادتی پر جب مزید زیادتی ہوتی ہے تو اس میں سختی کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ تو اس پیرائے کی تعبیر کے لئے قرآن مجید نے لفظ رابیہ استعمال کیا ہے۔

فاخذهم اخذہ رابیۃ (الحاقہ ۱۰)

ہم نے انہیں انتہائی سخت طرح پکڑ لیا۔ یہ رابیہ بھی رب و سے ہی ماخوذ ہے۔ اس کے مصدر کا فعل مضارع ربو اور ربی دونوں طرح قرآن مجید میں مستعمل ہیں۔

ربوہ لفظ کی قرات تین طرح کی جاتی ہے۔ عام مشہور قرات ”ربوہ“ ہے جب کہ ”ربوہ“ اور ”ربوہ“ بھی ہے۔ پہلی دو قراتوں کا ذکر لسان العرب نے کیا ہے۔ (لسان العرب، مادہ ربا) جبکہ تیسری قرات کا ذکر امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں (مفردات القرآن مادہ رب و) امام راغب نے اس کا تلفظ ”ربوۃ“ بھی پڑھا جانا ذکر کیا ہے۔ جبکہ لسان العرب نے ”ربوہ“ پڑھنے کو ترجیح دی ہے اور ربوہ پڑھنا بنو تمیم کی لغت قرار دیا ہے۔ اور اس کی جمع رب ی اور ربی بتلائی ہے۔ لسان العرب نے ”ربوہ“ پڑھنے کو شاید اس لئے رائج قرار دیا ہے کہ اہل عرب اپنی عام محاوراتی زبان میں کہتے ہیں مروت بنا ربوہ من الناس (وہی الجماعة العظیمہ نحو عشرة الاف) یعنی لوگوں کی ایک بڑی جماعت کا ہم سے گزر ہوا (جس سے مراد تقریباً دس ہزار اور اسی طرح ربوۃ کا استعمال بھی اہل عرب اتنی زبان میں اس طرح کرتے ہیں فلاں فی ربوۃ قومہ یعنی اس کا شمار اپنی قوم کے معزز لوگوں سے ہے) (اساس البلاغۃ مادہ رب و) لسان العرب میں مزید اس مادہ کا ماضی فعل مضارع اور مصدر اور اس کی توضیح اس طرح کی گئی۔

ربا الحسنی یربو ربوا ورباء

معنی زاد و نما یعنی کسی چیز کا بڑھنا اس کا مضارع یربو اور مصدر ربوا اور رباء معنی

زیادہ ہونا اور پڑھنا اور اس سے ثلاثی مزید فیہ اربیتہ غیتہ کہ میں نے اس کو زیادہ کیا اور پڑھایا قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ **یربی الصدقات** یعنی صدقات میں اضافہ کرتے ہیں اور حدیث صدقہ میں یوں مذکور ہے۔ **تربوا فی کف الرحمن حتی تکون اعظم من الجبل** کہ صدقہ رحمن کے ہاتھوں میں بڑھ کر پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ اور عام محاورہ میں کہتے ہیں ربا السویق یعنی ستو میں جب پانی ڈالا جاتا ہے تو وہ پھول جاتا ہے اس کے لئے یہ محاورہ بولا جاتا ہے اسی طرح قرآن مجید میں زمین کی جو صفت بیان ہوئی ہے۔ **مثلا اهتزت وربت ای عظمت و انتفعت**

یعنی زمین پھول کر پھٹ پڑی۔ حدیث شریف میں ہے یہ لفظ اس طرح وارد ہے۔ **الفرحوس ربوة الجنة ای ارفعها** یعنی فردوس جنت کی اونچی جگہ ہے باقی جنتوں کے مقابلہ میں (لسان العرب ماہ رب و) ربوہ اور ربوہ کے فرق کو اکثر لغات نے تو واضح نہیں کیا۔ جبکہ ابن کثیر نے اس کتاب التہامیہ فی غریب الحدیث والاثر میں یہ فرق کیا ہے۔ **الربوہ بالضم و الفتح و الضم ما ارتفع من الارض**۔ یعنی ربوہ مضموم اور مفتوح دونوں طرح مگر اگر مضموم ہو تو اس کا معنی سطح زمین سے اونچی زمین۔ باقی اگر بالفتح ہو تو یہ زبانی کے معنی میں ہو گا۔ جیسا حدیث طمعة کے حوالے سے مذکور ہے **من ابی فعلیہ الربوہ** یعنی جو زکوٰۃ کا انکاری ہو تو اس سے اصل زکوٰۃ کی رقم سے زائد وصول کیا جائے گا۔ اور اس طرح **من اقر بالجزیہ فعلیہ الربوہ** یعنی جو اسلام اس لئے قبول نہیں کرتا کہ اس میں آکر زکوٰۃ دینی پڑے گی تو اس کے اصل جزئیہ کی رقم سے زائد جزئیہ لیا جائے گا۔ (التہامیہ فی غریب الحدیث والاثر ج ۲ ص ۱۹۳) اس فرق سے تو یہ قول راجح ٹھہرا کہ قرآن مجید نے جن دو جگہوں میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ اسے ”ربوہ“ پڑھنا اولیٰ ہے۔ جیسا کہ صاحب لسان العرب کی ترجیح ہے۔ **المعجم المفہر للفاظ الحدیث** کے حوالہ سے ترمذی میں سورۃ المؤمنون کی تفسیر میں اس لفظ کے ذیل میں لکھا ہے۔ **الفرحوس ربوة الجنة و اوسطها و افضلها**۔ یعنی فردوس یہ جنت کا ربوہ (اونچی جگہ) اور جنت کا بہترین مقام ہے۔ اور

مسند احمد میں منقول ہے۔ الا ان عمل الجنة حزن بربوه۔ (مسند احمد ص ۳۲۷ وج ۳ ص ۳۶۰)

۲- روایتی تجزیہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم علیہما السلام کو جس جگہ ٹھکانہ دیا اس کو ربوہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر موضح القرآن حاشیہ میں نقل فرماتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب ماں سے پیدا ہوئے تو اس وقت کے بادشاہ نے نجومیوں سے سنا کہ بنی اسرائیل کا بادشاہ پیدا ہوا ہے۔ وہ ان کی تلاش میں پڑا، ان کو بشارت ہوئی کہ اس کے ملک سے نکل جاؤ۔ وہ نکل کر مصر کے ملک گئے۔ وہ گاؤں تھائییلے پر اور پانی وہاں کا خوب تھا۔ (شاہ عبدالقادر۔ ترجمہ قرآن مجید ص ۵۷۱ تاج کھنٹی)

(۲) تفسیر جلالین نے بھی اسی نقطہ سے اتفاق کیا ہے۔

فذكر في سبب هذا الايواء ان ملك ذلك الزمان عزم على قتل عيسى
یعنی اس کے ٹھہراؤ کے سبب کے بیان میں کہ اس زمانے کے بادشاہ نے حضرت عیسیٰ کو قتل کرنا چاہا۔ (تفسیر جلالین کلاں حاشیہ ص ۳۹۰ مطبوعہ نور محمد کراچی)

(۳) تفسیر مظہری کا بھی اس سے اتفاق ہے کہ یہودی بادشاہ ہیردوس جب حضرت عیسیٰ کے قتل کے درپے ہو گیا تھا تو حضرت مریم بچہ کو لے کر مصر چلی گئی تھیں۔ (تفسیر مظہری ج ۸ ص ۱۹۱)

(۴) تفہیم القرآن میں ہیردوس کے بعد ارخلاؤس کے عہد حکومت کا ذکر ہے۔ کہ ان کی والدہ کو گلیل کے شہر ناصره میں پناہ لینی پڑی (بحوالہ متی ۱۳۲ تا ۲۲) تفہیم القرآن ج ۳ ص ۲۸۱)

(۵) تفسیر حسینی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ رملہ فلسطین ہے انہوں نے کشاف کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رملہ

فلسطين یہ ربوہ ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ ٹھہرے۔ (قلمی نسخہ تفسیر حسینی ص ۶۶ ج ۳)

رملہ کا واحد الرمل ہے۔ فلسطین کا بہت بڑا شہر ہے۔ اور یہ مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی رہ چکی ہے۔ (معجم البلدان ج ۳ ص ۶۹)

(۶) قلمی تفسیر۔ قرآن القرآن بابیان مولفہ کلیم الدین نور اللہ ۱۱۳۷ھ کے حوالہ سے ربوہ، ارض مرتفعہ وہی بیت المقدس او دمشق او ایلیہ فلسطین او مصر یعنی ربوہ یہ اونچی زمین کو کہتے ہیں یہ یا تو بیت المقدس یا دمشق یا ایلیا فلسطین یا مصر ہے۔ (تفسیر مذکور کا صفحہ ۴۲۳) ایلیاء کے متعلق معجم البلدان میں مذکور ہے کہ اسم مدینہ بیت المقدس کہ یہ بیت المقدس کے کسی شہر کا نام ہے (معجم البلدان ص ۲۹۳ ج ۱) دمشق کے وضاحتی نوٹ میں صاحب معجم البلدان آیت و آوینا ہما نقل کر کے لکھتے ہیں کہ وہی دمشق ذات قرار و معین و ذات رفاء من العیش یعنی یہ دمشق ہے کہ جو زندگی کی نعمتوں سے مالا مال ہے، پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ان عیسیٰ یخزل عند المنارہ البیضاء من شرقی دمشق کہ عیسیٰ علیہ السلام کہ دمشق کے شرقی سفید مینار پر نزول فرمائیں گے۔ اور و المفارۃ التی فی جبل یثرب یقال انہا مکان ماوی عیسیٰ علیہ السلام اور جبل یثرب کی جو غار ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ کی جائے پناہ تھی۔ (معجم البلدان ج ۳ ص ۴۶۳) اسی طرح اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں دمشق کے وضاحتی نوٹ کے سلسلہ میں مذکور ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ (یہاں) ایک پر سکون ٹیلہ (ربوہ) پر قیام فرمائے ہوئے تھے۔ (الی ربوہ ذات قرار ۲۳: (المومنون ۵۰) اور دنیا کے خاتمے کے قریب دجل سے لڑنے کے لئے سفید مینار پر جسے کبھی تو مشرق مینار قرار دیا جاتا تھا اور کبھی مسجد جامع کا شرقی مینار نزول اجلال فرمائیں گے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۹ ص ۴۳ مارہ (دمشق)

(۷) مولانا ابوالکلام، ترجمان القرآن میں اس آیت کے زیر حاشیہ تحریر کرتے ہیں ہم نے انہیں ایک مرتفع مقام پر پناہ دی جو بننے کے قابل اور شاداب تھی۔ غالباً اس

سے مقصود وادی نیل کی بالائی سطح ہے یعنی مصر کا بالائی حصہ۔ اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی پیدائش کے بعد مریم (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۵۳ مطبوعہ اسلامی اکلوی)

(۸) امام قرطبی نے الجامع الاحکام القرآن میں تحریر کیا ہے کہ ابو ہریرہ کے ایک قول بموجب فلسطین اور رملہ ہے اور نبی علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔ نیز ابن عباس، ابن المسیب اور ابن سلام کے نزدیک یہ دمشق ہے۔ کعب اور قتادہ کے نزدیک بیت المقدس اور ابن زید کے نزدیک مصر (الجامع الاحکام القرآن ج ۱۲ ص ۱۳۶ مطبوعہ ایران)

(۹) البدایہ و النہایہ میں ضحاک عن ابن عباس روایت کرتے ہیں یہود کے خطرہ کے بموجب اللہ تعالیٰ نے آپ کی والدہ کی طرف وحی کی کہ انہیں مصر کی طرف لے کر چلی جائے۔ اور قرآن مجید میں و جئنا ابن مریم وامہ ————— میں اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔ (البدایہ ج ۲ ص ۷)

(۱۰) تفسیر حسینی کے قلمی نسخہ میں ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے ”آوردہ اند کہ مریم با پر عم خود یوسف بن مائمان دوازہ سال در آن موضع بسر کردند“ یعنی حضرت مریم اپنے لڑکے اور یوسف بن مائمان اپنے چچا کے صاحبزادہ کے ہمراہ ۱۲ سال اس جگہ پر رہے۔ (تفسیر حسینی قلمی ص ۶۶۰ محفوظ کتب خانہ جامعہ عربیہ چنیوٹ ضلع جھنگ)

(۱۱) جلالین نے تفسیر صاوی کے حوالہ سے یہی بات نقل کی ہے کہ آپ کی والدہ اس ٹیلہ پر لے گئیں اور یہاں ۱۲ سال رہیں اتنے میں وہ باوشاہ مر گیا۔ (جلالین کلاس حاشیہ ص ۲۹۰)

(۱۲) مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی قصص القرآن میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات پر تبصرہ فرماتے ہیں انہوں نے حضرت عیسیٰ کی جائے ولادت کی جگہ کو ٹیلہ (ربوہ) سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ وہ جگہ ہے کہ آپ کی والدہ پیدائش کے قریب بیت المقدس سے دور تقریباً ۹ میل و کوہ سراء (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اب بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے۔ (قصص القرآن ج ۲ ص ۴۲) بیت اللحم

کے متعلق صاحب معجم البلدان نے یہ توضیح کی ہے۔ بیت المقدس کے آس پاس ایک پر رونق جگہ ہے۔ یہاں ایک جگہ مد عیسیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کا محل وقوع بیت المقدس سے جبرین کی طرف ہے۔ جبرین بیت المقدس اور مبقلان کے درمیان ایک قلعہ ہے۔ اس کو عمرو بن العاص نے فتح کیا تھا اور اس کو اپنی جاگیر میں شامل فرمایا۔ اس کا نام غلام کے نام پر عبلان رکھا۔ اور ایک روایت کے مطابق بیت اللحم دمشق اور حلبک کے درمیان ایک بستی کا نام ہے۔ (معجم البلدان ص ۱۰۲ ج ۲) اسی سائیر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے ظہور کی پیشین گوئی سابقہ آسمانی کتابوں میں ہوئی۔ چنانچہ قصص القرآن میں مذکور ہے۔ تورات انجیل اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود آج بھی چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہے۔ جو مسیح علیہ السلام کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ تورات استثناء میں ہے اور اس موسیٰ نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (سائیر) سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔ (باب ۳۳ آیت ۱۰) اس بشارت میں سینائے خدا کی آمد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور سائیر سے طلوع ہونا نبوت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہے۔ کیونکہ ان کی ولادت باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام بیت اللحم میں ہوئی اور متی کی انجیل میں ہے۔ جب یسوع ہیردوس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت اللحم میں پیدا ہوا۔ (باب ۳ آیات ۲۹) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی سرزمین ہے جسے الی ربوۃ ذات قرار و معین کہا گیا ہے۔

(۱۳) ابن کثیر نے تفسیر میں لفظ معین کی تشریح میں لکھا ہے کہ معین سے نمرجاری مراد ہے اور یہ اس نمر کا ذکر ہے جس کو آیت **قد جعل ربک تحتک سربا** میں بیان کیا گیا ہے۔ اور ضحاک اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ کہ **الی ربوۃ ذات قرار و معین** سے بیت المقدس کی سرزمین مراد ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے۔ (قصص القرآن ص ۴۶ ج ۴۴)

(۱۴) جامعہ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ کے نامور مفسر قرآن محمد علی الصابونی نے اپنی

تفسیر صفوة التفسیر میں آیت و آویناہما کے تحت ابن کثیر سے موافقت کی ہے وہ کہتے ہیں
ای وجعلنا منزلہما وما واهما الی مکان مرتفع من ارض بیت المقدس
(صفوة التفسیر ص ۳۱۰ ج ۲) یعنی ان دونوں کی جائے رہائش اور ان کا ٹھکانہ بیت
المقدس کی اونچی زمین پر بتائی۔ اور ذات قرار و معین ای مستویہ یستقر علیہا
و ما جاء ظاہرا للمعینون قال الرازی 'القرار' المستقر کل ارض مستویہ
مبسوطہ والمعین' الماء الظاهر جاری علی الارض و عن قتادہ ذات ثمار
و ماء یعنی انہ لاجل الثمار یستقر فیہا ساکنوہ۔ یعنی ذات قرار و معین
سے مراد ہموار زمین اور پانی کا چل چلاؤ آنکھوں سے دکھائی دے رہا ہو۔ امام رازی کے
حوالہ سے قرار سے مراد ہموار زمین ہے۔ اور معین سے مراد زمین پر چلتا ہوا پانی قتادہ
کے نزدیک پانی کے ساتھ پھیلی ہوئی۔ کیونکہ پانی اور پھلوں کی وجہ سے لوگوں کا وہاں
رہائش پذیر رہنا ممکن ہو گا۔ (صفوة التفسیر سابقہ حوالہ)

روایت تطبیق

اس توضیح نے تو میں بیٹے (یعنی عیسیٰ اور ان کی والدہ) کی رہائش گاہ اور ٹھکانے
کو ایک سبز و شاداب جگہ کو قرار دیا ہے۔ جہاں زندگی کی ضروریات خوب ہوں اور
جنت نظیر جگہ ہو۔ صاحب معجم البلدان اس کو دمشق قرار دیتے ہیں (جیسا کہ پہلے گزر
چکا ہے) بیت اللحم دمشق اور حلبک کے درمیان واقع ہے اگر آپ کی پیدائش بیت
اللحم میں ہوئی ہو تو دمشق سے ملحقہ ہونے کی وجہ سے اس کو دمشق کہہ دیا جائے تو
عین ممکن ہے پھر صاحب معجم البلدان کے بقول کہ بیت المقدس کے آس پاس ایک
جگہ ”مہد عیسیٰ“ سے مشہور ہے۔ اس جگہ کو اگر دمشق میں شامل کر لیا جائے تو یہ
عین ممکن ہے۔ اور چونکہ حضرت عیسیٰ کو دمشق سے خاصی مناسبت ہے کہ قرب
قیامت وہ دمشق کی جامع مسجد کے شرقی مینارہ پر نزول فرمائیں گے۔ تو اس مناسبت سے
آپ کی پیدائش جو کہ بیت المقدس کے قریب کوہ ساعیر پر دمشق کا اطلاق کر دیا جائے

تو یہ بھی خلاف قیاس نہیں۔ چونکہ قرآن پاک نے خود اس کو مطلق چھوڑا ہے مقید نہیں کیا اس لئے اس کو ایک جگہ سے مقید تو نہیں کیا جاسکتا۔ اب ربوہ سے مراد روایات کی روشنی میں حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش کو لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگلے زمانہ کے تغیرات کے بموجب آپ نے جو مختلف جگہوں پر سکونت اختیار کی ہو تو یہ معجزاتی رنگت اختیار نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے جس خصوصیت سے بطور انجام جس جز کا آیت شریفہ میں بیان کیا وہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ حمل سے لے کر زمانہ ولادت تک کے واقعات کا احاطہ اور بحفاظت دنیا پر ظہور پذیر ہونا ہے۔ اس مذکور بالا قول کی تائید مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانی کے تفسیری وضاحتی نوٹ سے ہوتی ہے جو انہوں نے آیت **آیت الی ربوہ ذات قرار و معین** کے زیر فائدہ نمبر ۳۲ تفسیر کے حاشیہ میں تحریر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں شاید یہ وہی ٹیلہ یا اونچی زمین ہو جہاں وضع حمل کے وقت حضرت مریم تشریف رکھتی تھیں۔ چنانچہ سورہ مریم کی آیت **فنادھا من تحتھا** دلالت کرتی ہے کہ وہ بلند جگہ تھی نیچے چشمہ یا نہر بہہ رہی تھی۔ اور کعبور کا درخت نزدیک تھا لیکن عموماً مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح کے بچپن کا (پھر ہیردوس وغیرہ کا واقعہ نقل کیا) مزید آگے لکھتے ہیں۔ بعض نے ربوہ (اونچی جگہ) سے مراد شام یا فلسطین لیا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ جس ٹیلہ پر ولادت کے وقت موجود تھیں وہیں اس خطرہ کے وقت بھی پناہ دی گئی ہو۔ (تفسیر عثمانی ص ۴۳۵۹ حاشیہ فائدہ نمبر ۱۲)

اس جائے ولادت کی تصویر کشی کرتے ہوئے ابن بطوطہ کے حوالہ سے دائرہ معارف بستانی نے ربوہ Rabwah عنوان کے تحت یہ عندیہ دیا ہے ”جبل فاس کے آخر پر حضرت مسیح علیہ السلام اور آپ کی والدہ کی رہائش گاہ کی جگہ ہے۔ اور یہ جگہ دنیا کی تمام حسین جگہوں سے زیادہ حسین سیرگاہ ہے۔ اس میں خوبصورت پختہ محلات عمارتیں اور عجیب و غریب باغات ہیں اور حضرت عیسیٰ کی رہائش گاہ کی جگہ اس میں ایک چھوٹی غار نما جگہ ہے۔ اس کے سامنے حضرت خضر کا مصلیٰ ہے پھر مزید یا قوت

حموی کے حوالہ سے آبی گزرگاہوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ یہ جگہ شمالی دمشق جبل فاس کے پہلو میں ہے۔ اس کے نیچے پروی دریا بہتا ہے اور یہ جگہ ایک اونچی مسجد کی شکل میں دریا ٹوری پر ہے۔ اس جگہ سے اوپر دریا یزید گزرتا ہے۔ اس کا پانی مسجد کے حوض میں گرتا ہے اس مسجد کے ایک کونہ میں ایک چھوٹی غار نما جگہ ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جس کا آیت الی ربوہ ذات قرار و معین میں ذکر ہے۔ (دائر معارف بستان ج ۸ ص ۵۳۸ مادہ ربوہ دار المعرفہ بیروت) نیز صاحب معجم البلدان یا قوت بن عبد اللہ الحموی جس کا حوالہ بھی گزرا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد دمشق ہے۔ دمشق کے پہاڑ کے دامن میں دنیا کی جنت نظیر جگہ ہے۔ اس کے نیچے دریا بروی ہے۔ یہ دریا ٹوری پر ایک تاریخی مسجد کی شکل میں تعمیر شدہ ہے۔ اس کے اوپر دریا یزید بہتا ہے۔ جس کا پانی اس مسجد کے حوض میں گرتا ہے۔ اس مسجد کے ایک پہلو میں ایک گھٹلی سی غار نما جگہ ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی ہے۔ جس کا قرآن مجید میں اس آیت کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ (معجم البلدان ج ۳ ص ۲۶ دار صلور بیروت)

نہر بروی یا رد دریا بروی یہ دمشق کا سب سے بڑا مشہور دریا ہے۔ دمشق سے کوئی پانچ میل دور قنوا نامی جگہ سے، حلبک کے نزدیک چشموں کے پانیوں سے بنتا ہے۔ اس کا کچھ پانی نہر یزید یا دریا یزید میں چلا جاتا ہے اسی طرح جب یہ دریا درناہی بستی کے پاس پہنچتا ہے تو اس کا پانی پھر تین حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ یعنی دریا بروی کے شمال میں شمل ٹوری نامی دریا اور مغربی جانب بانس نامی دریا میں (معجم البلدان ج ۱ ص ۳۷۸) دریاؤں آبشاروں چشموں سرسبز شاداب مقلات کی بہتات یہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی جنم بھومی قرار پاتی ہے۔

ربوہ کا تحریفی پہلو

ربوہ کا لفظ ہمیں دمشق سے پاکستان کے ضلع جھنگ تحصیل چنیوٹ کے قدیمی گاؤں ”ڈھکیاں“ جو کہ دریائے چناب کے شمالی کنارہ پر فیصل آباد سرگودھا روڈ پر واقع لے جاتا ہے۔ اس گاؤں کو آج ”ربوہ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب کہ اس کا اصلی نام کائناتِ ممل میں بدستور ”ڈھکیاں“ (چک ڈھکیاں) چلا آ رہا ہے۔ اصلی نام کی جگہ یہ نقلی نام کی تبدیلی پاکستان بننے کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ جب گورنر موڈی نے اس چک کی زمین ۹۰ سالہ ٹھیکہ پر انجمن احمدیہ کو دی۔ تو قادیانی جماعت کے وڈیروں نے اس چک کا نام اپنی مذہبی مناسبت سے ”ربوہ“ رکھا۔ قرآنی لفظ کا بے جا استعمال تحریفِ قرآن کے زمرے میں آتا ہے۔ جو کہ کفر کی نپاک سازش ہے جو کہ کفر کا وطیرہ چلا آتا ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جہاں انہوں نے اپنی تفسیر میں (جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے) آیت **الٰہی ربوۃ ذات قرار معین** کے معنی قادیانی نظریہ کشمیر کی تردید کی ہے۔ کہ ربوہ سے مراد کشمیر ہے۔ وہ اس ربوہ کی بھی تردید کرتے چونکہ یہ ربوہ بعد میں بنا جب وہ دنیا سے جا چکے تھے۔ لہذا انہیں تردید کا موقع نہ ملا۔

(ب) ربوہ سے مراد کشمیر

مرزا بشیر الدین محمود اپنے قرآنی ترجمہ بعنوان تفسیر صغیر میں آیت و آویٹاھا کے تحت کیا ہے کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ اونچی جگہ کشمیر تھی بائبل یہودیوں اور ہندوؤں کی تاریخ سے بہت سے حوالے اس کی تائید میں ملتے ہیں۔ قادیانی وڈیرے مرزا بشیر الدین کو مسلمانوں کی تاریخ سے کوئی حوالہ تو نہ مل سکا البتہ کدھم جنس باہم جنس پرداز کے مصداق اپنی کفار برادری سے اس کے تائیدی حوالے ملے۔ پھر دیانت داری یہ کہ ایک حوالہ بھی تحریر میں نہ لاسکے۔ اس طرح قرآنی ترجمہ نگار مولوی محمد علی نے

بھی اس آیت کے ذیل میں اپنی کتاب ”بیان القرآن“ میں مسلم مورخین مفسرین اور ترجمہ اور تفسیر نگاروں کی جملہ آراء کو جھٹک کر رکھ دیا اور اپنے کشمیر کے نظریے کو پیش کرنے میں سعی لاکھائی کی۔ چنانچہ ملاحظہ ہو کتاب مذکورہ پر اس کا وضاحتی نوٹ (بیان القرآن ص ۹۳۵) کشمیر تو پرانی تحقیق ہے۔ اب ربوہ نام کی بستی پاکستان ضلع جھنگ کے نقشہ میں موجود ہے۔ تو اس کا مصداق قادیانیت کی نگاہ میں یہی وہ ربوہ ہے جو آیت میں مذکور ہے۔ اگر قادیانیت کو غیر مسلم قرار دینا ضروری تھا تو اس قرآنی اصطلاح اور لفظ کا تقدس اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کو بھی تبدیل ہونا چاہئے۔ اور اس کی جگہ چک ڈمکیاں اصل نام زبان خلق ہونا چاہئے۔ کفر اور مشرعا لکفر دونوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ مسلمان علماء میں سے حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی دامت برکاتہم نے اس سلسلہ میں کافی کوشش کی ہے کہ اس (ربوہ) نام کو تبدیل کیا جائے۔ اور اس کا غیر سرکاری نام صدیق آباد تجویز کیا جسے بلدیہ ربوہ نے اپنے ایک بل کے ذریعے اس تبدیلی کو پاس کر لیا ہے۔ مگر ہنوز عمل درآمد نہیں ہوا۔

حاصل بحث

بحث کا حاصل یہ ہوا کہ واقعات اور حقائق کے تناظر میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی جگہ ”بیت اللحم“ ہے اور یہ جگہ ایک ٹیلہ ہے جیسا کہ الموسوعۃ الذمیہ میں مذکور ہے۔ وہی تقع علی تلال تخمیا مزارع الکروم والزیتون۔ یعنی یہ ٹیلہ ہے جس کے گردا گرد زیتون اور انگور کے کھیت ہیں اور اس کتاب میں بیت اللحم کی تعریف میں ذکر کیا ہے۔ و هی لیست بعینہ عن مدینۃ القدس لیست فی بیت اللحم سوی شارع واحد طویل یقود الی کنیستہ المیلاد الی شیدت فی المکان الذی یعتقد ان المسیح ولد فیہ یعنی بیت اللحم Bythlehem قدس شہر سے زیادہ دور نہیں اور اس میں صرف ایک لمبی سڑک ہے۔ جو کہ میلاد نامی گرجا کی طرف جاتی تھی۔ جو اس جگہ تعمیر شدہ ہے جہاں عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ کی پیدائش

ہوئی۔ (الموسوعہ الذمیتہ ج ۳ ص ۲۳۲) اسی طرح مفسرین نے آیت **فَعَمَلَتْهُ** **فَانْتَبَذَتْ** **بِهَ مَكَانًا قَصِيًّا** (مریم: ۲۲) یعنی حضرت عیسیٰ کی والدہ انہیں بوقت پیدائش ایک دور جگہ پر لے گئیں۔ کی نشان دہی بیت اللحم کی طرف کی ہے۔ جیسا کہ علامہ مضافی کا قول ہے **بَعِيدًا عَنْ اَهْلِهَا اَيْ اَقْصَى الْوَادِي وَهُوَ بَيْتُ اللَّحْمِ** یعنی اپنے گھر والوں سے دور وادی کے آخر یعنی بیت اللحم میں (الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم للفظادی ج ۱۰ ص ۸) بیت اللحم کی پہلے ہم معجم البلدان کے حوالہ سے لکھ چکے ہیں کہ یہ دمشق اور حلبک کے درمیان ہے یا بیت المقدس سے جبرین کی طرف ہے۔ یہ علاقہ فلسطین کا ہے۔ جیسا کہ مقبوضہ فلسطین کے اس جغرافیائی نقشہ سے واضح ہے۔ ذرا نقشہ ملاحظہ ہو۔ اس نقشہ کی رو سے جہاں مفسرین نے فلسطین رملہ، فلسطین بیت المقدس اور مصر کے اقوال درج کیے ہیں وہ سب اپنی اپنی جگہ درست ہیں یعنی اس سارے علاقہ پر فلسطین کی چھاپ ہے اور اس کے اندر یہ سب علاقے آ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دمشق بھی اس نقشہ میں شامل ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کی رہائش شہر ناصرو بھی اس میں ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کو المسیح الناصری کہا جاتا ہے۔ لہذا اب تمام احتمالات اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں باقی غیر مسلم قرآنی ترجمہ نگاروں نے جو ”ربوہ“ اس صفاتی نام سے کشمیر کا قول کیا ہے حقائق اس کی نفی کرتے ہیں۔ اور اس صفاتی نام سے کسی شہر کا حقیقی نام رکھنا یہ تحریف قرآنی کا ایک عملی ثبوت ہے۔ جو کہ غیر مسلم کا داؤ بیچ ہے۔ جو متشابہ آیات سے اپنی تاویل باطل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ جیسا کہ عیسائیوں نے د کلمتہ القاہا الی مریم و روح منہ سے حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کا دعویٰ کیا اور ان کی خدائیت کا قائل رہا۔ اور محکم آیت **ان هو الا عبد انعمنا علیہ** کہ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہیں اور رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔ اسی طرح غیر مسلم قادیانی فرقہ نے ربوہ کے محکم معانی میں تشابہ پیدا کرنے کے لئے اس صفاتی نام کا اپنی بستی پر اطلاق کر دیا اس کو محض حادثاتی واقعہ یا ترکاتی نام قرار نہیں دیا سکتا۔ بلکہ عمداً ”قصداً“ انہوں نے ایسا کیا ہے تاکہ اس جھوٹے مسیح موعود

(غلام احمد قادیانی) کو اس سچے مسیح موعود کے بالمقابل لایا جائے۔ پس قرآن مجید کا یہ دعویٰ **فَلَمَّا الذِّينَ فِي قُلُوبِهِمُ ذَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ** (آل عمران: ۷۵) کیسے فٹ نظر آتا ہے۔ کہ جن دلوں میں کجی ہے وہ قتلہ کی من پسند تویل سے پیوستہ رہتے ہیں۔ تاکہ لوگ شک و شبہ کا شکار ہوں اور ان کی باطل تویل کا راستہ ہموار ہو جائے۔

ڈاکٹر سید محمد اعجاز الحسن شاہ
شکریہ ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان